Blank

سُرخ انار کا راز

مصنّف

مجید مُلّا محمدی

مترجم

سیّد حسن مہدی حسینی، خان محمد صادق جونپوری

اسلامی کتاب گھر، دہلی وتکا توسعہ کتاب ایران

نام کتاب : سرخ انار کا راز (فارسی افسانوں کا اُردو ترجمہ)

تصنیف : مجید مُلّا محمدی

مترجم : سیّد حسن مہدی حسینی، خان محمد صادق جونپوری

ناشر : اسلامی کتاب گھر، دہلی وتکا توسعہ کتاب ایران

زیر نظر : مرکز تحقیقات فارسی رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی

سن اشاعت : ۱۴۳۱ھ ق/ ۱۳۸۸ھ ش/ ۲۰۱۱ء

کمپوزنگ : راحت آفسیٹ پرنٹر، الشاہی مسجد، رشید مارکیٹ، دہلی

صفحہ آرائی : علی رضا

ٹائٹل : حارث منصور

مطبع : الفا آرٹ، نوئیڈا (یو۔پی۔)

فہرست

- تھیلی ۷
- جامع مسجد میں چور ۱۷
- امامِ زمانؑ کی رعیّت ۲۶
- سُرخ انار کا راز ۳۴
- اس فتوے کی خاطر ۴۹
- محبت کے غنچے ۵۸
- میرا حق دو ۶۴
- مہرِ بے پایاں ۶۶
- بچہ کی گمشدہ چیز ۸۴
- کس لیے ڈرنا ۸۷
- سونے کا گلوبند ۹۵
- اس کتاب کی خاطر ۹۹
- عزیز ہم سفر ۱۰۵
- فوجی جوان ہمارے گھر کے مہمان ۱۰۸
- بیٹا میرے ساتھ ساتھ پڑھو ۱۱۵
- نایاب کتاب ۱۲۵
- پہاڑ کی مانند شخص ۱۲۹
- بوعلی کی نماز ۱۳۷
- نماز فارسی زبان میں ۱۴۱
- نوجوان مجتہد ۱۵۰
- سونے کی تھیلیاں ۱۵۳
- دوستی کا قصہ ۱۶۳
- سیّد صاحب بتایئے ۱۶۷
- پڑوسی کے یتیم ۱۷۱
- چاندی جیسے انجیر کے درخت کے نیچے ۱۷۵
- اُس رات جو کچھ گذرا ۱۸۲
- تھیلی جس سے نرگس کے پھول کی خوشبو آتی تھی ۱۹۱
- تاروں بھری رات ۲۰۰
- برکت والی کتاب ۲۰۸
- تم تھے اور نجف کا لازوال سورج ۲۱۱
- شیخ بہائی اور میر داماد ۲۱۷
- لازوال مسافر ۲۲۱
- خالی بلبلے کی مانند ۲۲۶
- استاد کا عجیب خواب ۲۳۳
- سیّد جواد تمہارے اُوپر افسوس ۲۳۶
- سورج مکھی کے مانند ۲۴۲

تھیلی

"ارے کیا بات ہے؟ کس کے پیسے چوری ہوگئے ہیں؟"
نگہبان کی آواز اور دریا کی موجوں کا شور آپس میں گھل مل گیا۔ کشتی کے نگہبان نے دو بارہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں اپنے جملہ کو دہرایا۔
ایک نوجوان مسافر کشتی کے عرشہ پر آیا اور بڑی بیکسی سے نالہ وفریاد کرنے لگا:
"میرے پیسے کسی نے چرالئے، میری تھیلی چوری ہوگئی"۔
ایک ایک کر کے سارے مسافروں نے اسے گھیر لیا۔ کشتی کے عملہ کے کچھ لوگ بھی وہاں جا پہنچے۔
جوان مسافر برابر چیخ پکار کر رہا تھا، سر پیٹ رہا تھا اور کہہ رہا تھا:
"میں لٹ گیا، برباد ہوگیا"۔
نگاہیں گھومیں۔ مسافر آدمی نے ہاتھ سے مسافروں کی طرف اشارہ کیا۔ ایک زور دار ہوا نے کشتی کے اُونچے بادبان کو نیچا یا اور کشتی نے ایک جھکولا کھایا۔
بوڑھا آدمی پریشان ہوا مگر اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ سارے مسافر سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جوان مسافر ناخدا کے قدموں پر گر پڑا اور اپنے چہرے کو اس کے زانو پر رکھ کر التجا کرنے لگا۔
بوڑھے آدمی کا دل کانپنے لگا۔ اس نے خود سے کہا:
"خانۂ خدا کے راستہ میں اور چوری! میں نے تو ہر چیز کو دیکھا ہے۔ تو چور

ہے یا میں۔ پروردگار میری مدد فرما"۔
ناخدا نے اپنی کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیرا، جوان مسافر کو کھڑا کیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا:
"تمہارے پیسے کی پہچان کیا ہے؟"
ناخدا کی ہیبت ناک نگاہوں نے جوان مسافر کے دل میں خوف پیدا کر دیا۔ اس نے لوگوں کی طرف نظریں گھمائیں اور اٹکتے اٹکتے کہا:
"طوسی رنگ کے ایک تھیلی میں تھا اور تھیلی مخمل کی تھی۔ اس میں سونے کے سکّے تھے اور اسے سنہری ڈوری سے تین دفعہ باندھ رکھا تھا"۔
لوگ ناخدا کی طرف متوجہ تھے تا کہ اس کے ردِّ عمل کو دیکھیں۔ بوڑھا آدمی حیران و پریشان تھا۔ ناخدا نے بلند آواز سے کہا:
"کشتی کے اسٹاف، تمام مسافروں کی تلاشی لیں، اگر اس پہچان والی تھیلی مل جاتی ہے تو اس شاطر چور کو میرے پاس لائیں تا کہ میں اسے سزا دوں۔ خانۂ خدا کے راستہ میں... اور چوری؟"
قافلے والوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ ہوا کشتی کے بادبان کے دل کو گدگدا رہی تھی اور کشتی دریائے عمان کو چیرتی ہوئی آگے چلی جا رہی تھی۔ آسمان روشن اور صاف تھا۔ سفید بادل کے ٹکڑے وحشی پرندوں کی طرح کشتی کے اوپر سے گزر رہے تھے۔
کشتی کے ملازمین مسافروں کی گہرائی سے چھان بین میں لگ گئے۔ بوڑھا آدمی گھبرایا۔ ناخدا، جوان مسافر کو اپنے ساتھ لیے ہوئے اس کے کمرہ میں آیا۔
بوڑھے آدمی کو کچھ دیر پہلے کی بات یاد آ گئی:
"میں کشتی کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا اپنے پیسوں کو گن رہا تھا کہ اس مکار کا سایہ میرے اوپر پڑا۔ کوئی راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ تھیلی کو کمر سے بندھی ہوئی شال میں رکھ لوں۔ اس کی آنکھیں کتنی بے رحم تھیں"۔

جیسے ہی میں نے اس کی طرف دیکھا اس نے اپنے چہرہ کو دریا کی سمت موڑ لیا اور جس طرح کوئی مرغابی پر پھڑ پھڑا کر اپنی جُھنڈ میں چلی جاتی ہے وہ مسافروں کے درمیان چلا گیا۔

تفتیشی عملہ پہنچنے ہی والا تھا۔ بوڑھا آدمی بہت پریشان ہوا۔ اس نے دریا کے اُس پار نگاہ ڈالی۔ خانۂ خدا یاد آیا۔ اشک کے چھوٹے چھوٹے قطرے اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں بھر گئے۔ اس کو بہت تکلیف ہوئی کہ جوان مسافر کی مکاری کی وجہ سے وہ کشتی کے غضبناک عملہ کی گرفت میں آنے والا تھا۔ اس کا دل سلگ اٹھا۔ دفعتاً اس کے دل میں ایک خیال آیا، اس کی نگاہیں ابھی بھی دریا کے نیلے پن کے اس پار ٹکی ہوئی تھیں۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور تھیلی پر ہاتھ رکھا۔ اس کے پیر خوف سے کانپ رہے تھے۔ تھیلی کو اطمینان سے اپنی کمر کے گرد لپٹی شال سے باہر نکالا۔ آس پاس کا جائزہ لیا اور کشتی کے سرے پر چلا گیا۔ سورج نے دریا کے بیچ سے اسے آنکھیں ماریں۔ ایک بھاری لہر اس کے سامنے آئی اور خود کو کشتی کے لکڑی کے پیندے سے رگڑا اور منھ کھول دیا۔

کسی نے بوڑھے آدمی کے دل میں کہا:

''پیسوں کو موجوں کے حوالے کر دو۔ جلدی کرو کہ خطرہ نزدیک ہے''۔

بوڑھے آدمی نے دکھی دل سے کہا:

''اے امیر المومنینؑ آپ امینِ خدا ہیں۔ میں اپنے پیسے کی تھیلی کو آپ کے حوالے کرتا ہوں''۔

اور اسے جھاگ سے بھری لہر کے منھ میں ڈال دیا۔ موج کشتی کے پیندے سے الگ ہوئی اور اپنی جگہ کو دوسری لہر کے حوالے کر دیا۔ بوڑھے آدمی نے بہت ہی اداسی سے دریا سے نظریں ہٹائیں اور آہستہ سے بیٹھ گیا۔

''اب کس طرح خالی ہاتھ حج کے سفر پر جاؤں، کیونکر اعمالِ حج بجالاؤں اور کس طرح یہ مسافت طے کر کے اپنے شہر واپس جاؤں، یا امیر المومنینؑ؟''

تفتیشی عملہ بوڑھے آدمی کے پاس جا پہنچا۔ ان میں سے ایک نے جو بہت ہی خونخوار چہرہ والا تھا کہا:

''اٹھو، کھڑے ہو جاؤ''۔

بوڑھا آدمی کھڑا ہو گیا۔ عملہ نے اس بوڑھے کی اچھی طرح سے تلاشی لی۔ اس کے ساز و سامان کو کئی بار کھنگالا اور دوسرے عملہ سے کہا:

''اس بوڑھے کے مال و اسباب میں کچھ نہیں ہے''۔

اسی درمیان ناخدا اور جوان مسافر کچھ دوسرے لوگوں کے ہمراہ اس بوڑھے آدمی کے پاس آ دھمکے۔ عملہ نے بوڑھے آدمی کی شال کو کھولا اور ناخدا کے سامنے اسے اچھی طرح جھٹکارا۔ جوان مسافر تھوڑا پیچھے کو سرک گیا۔

''جناب ناخدا، اس بوڑھے آدمی کے اثاثہ اور سامان میں بھی نہیں تھا۔ اس کے کپڑوں کو بھی اچھی طرح کھنگال ڈالا ہے اور یہ اس کی سفید شال''۔

جوان مسافر پریشان ہوا اور اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھا پھر ناخدا کو گھورنے لگا۔

تفتیشی عملہ نے باقی بچے لوگوں کی بھی تلاشی لی اور ناخدا اور جوان مسافر کے پاس آئے۔

ناخدا نے غصے سے جوان مسافر سے کہا:

''تمہاری تھیلی تو ملی نہیں، پھر کہاں ہے؟ کیوں خانۂ خدا کے مسافروں پر تہمت لگاتا ہے؟''

جوان مسافر الٹے پاؤں چلنے لگا۔ اپنے ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ لیں، زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ چاہا کہ بوڑھے آدمی کا پتہ بتا دے لیکن ڈرا کہ کہیں حالات اور بدتر نہ ہو جائیں۔

''یقہ..... یقیہ..... یقین کیجیے۔ جھوٹ نہیں بول رہا ہوں''۔

مسافروں کا شور بلند ہوا۔ ایک شخص نے چلا کر کہا:

''یقیناً یہ مکار آدمی ہے۔ بلاشبہ اس کے کام میں مکر و فریب ہے''۔

ناخدا غصے میں چند قدم آگے بڑھا۔ جوان مسافر جو پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، اچانک ایک ستون سے ٹکرایا اور عرشے پر گر پڑا۔ ناخدا چلایا:

"ارے اُسے پکڑو اور دریا میں ڈال دو، یہ رفیقِ قافلہ اور راستے کا چور ہے"۔

بوڑھے آدمی کا دل اس کے لیے کُڑھا۔ چاہا کہ بیچ بچاؤ کرے مگر اسے اپنے پیسوں کی تھیلی یاد آ گئی اور خاموش ہو رہا۔ جوان مسافر رونے لگا۔ عملہ نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو پکڑ لیا۔ اس نے نالہ و فریاد کرتے ہوئے کہا:

"میں نے غلطی کی۔ خدا کی قسم مجھ سے غلطی ہوگئی۔ یقین کیجیے، میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ فقط..."

تھوڑی دیر بعد دریا کی بڑی بڑی لہروں نے جوان مسافر کے شور و غل کو اپنے اندر سمو لیا۔ بوڑھا آدمی اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور اپنی بے بضاعتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ آ چلی تھی، اس نے سورج کے فانوس کی بتّی کو نیچے کھینچا اور پھر آہستہ سے اسے گل کر دیا۔

○

بوڑھے آدمی نے اپنے سامان میں سے کچھ چیزوں کو بیچ کر حج کے اعمال کے دنوں کو محتاجی و سختی میں بسر کیا۔ حج کے بعد نجف جانے کا قصد کیا تا کہ اپنے مولا امیر المومنینؑ سے مدد مانگے۔ ایک آہ کے ساتھ نجف کی طرف رُخ کر کے سلام کہا اور عراق جانے والے اونٹوں کے قافلے کے پیچھے پیچھے پیدل چل پڑا۔

یہ خدا کا کرنا تھا کہ تپتے ہوئے ریگستان اور جانکاہ راستوں کو طے کر کے درِ مولا پر صحیح و سلامت پہنچ گیا تھا۔ دورانِ سفر جو کوئی بھی اس کی کیفیت اور حالات کو دیکھتا مدد کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ بوڑھے آدمی نے خود کو مولا علیؑ کی ضریح کے مقابل پایا۔ اس کے دل کو راحت و سکون میسّر ہوا۔ روتے ہوئے امام علیؑ کی ضریح سے لپٹ گیا اور نالہ و فریاد کرنے لگا۔

"آقا میں غریب ہوں۔ آقا میں ہزاروں زحمتیں اٹھا کر ایران سے یہاں

آیا ہوں۔ اے میرے مولا! میری مدد کیجیے۔ وہ تھیلی جو میں نے دریائے عمان میں آپ کے حوالے کی تھی اسے لینے آیا ہوں۔ آقا میں آپ کا شیعہ ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے دھتکار دیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ میں دیارِ غیر میں گدائی کرنے لگوں"۔

ضریح کے پاس گر پڑا۔ آنسوؤں کے قطرے بارش کی طرح اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔ رات ہوگئی۔ خواب میں خود کو مولا علیؑ کے حضور میں پایا۔ حضرتؑ کے پیروں پر گر پڑا۔ وہی باتیں جو بیداری میں کہی تھیں دوبارہ کہیں۔ امامؑ نے ایک لطیف مسکراہٹ سے فرمایا:

"تم مرزا ابوالقاسم قمّی کے پاس جو قم میں ہیں، چلے جاؤ اور ان سے اپنی تھیلی لے لو"۔

بوڑھا آدمی خواب سے بیدار ہوا۔ امام کی گفتگو پر غور کیا اور پھر خود سے کہا:

"اس کا کیا مطلب ہے! میں نے اپنی تھیلی دریا میں ڈالی تھی۔ میں کیوں اتنا لمبا راستہ طے کر کے قم جاؤں۔ مرزا ابوالقاسم قمّی کون ہیں[1]"۔

اس کا رونا پیٹنا دوبارہ شروع ہوگیا۔ اس دن وہ دوبارہ ضریح سے لپٹ گیا تا کہ مولا اس پر کچھ عنایت و مہربانی کریں۔ رات میں پھر وہی عجیب خواب دیکھا۔ تیسری رات بھی وہی خواب اس نے دیکھا۔ تیسری رات جب مولا نے اس سے یہ فقرے کہے تو اس نے پوچھا:

---

۱. مرزا ابوالقاسم قمّی: ۱۱۵۱ قمری کو شفت گیلان میں پیدا ہوئے۔ ابتداء جوانی میں ہی مجتہد ہو گئے اور کافی عرصہ تک نجف و کربلا میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے، اس کے بعد قم چلے گئے اور وہاں لوگوں اور علما کے درمیان ایک بزرگ عالم نیز پارسا شخصیت کے عنوان سے مشہور ہوئے۔ ان کی بہت سی اہم تصانیف جن میں سے کچھ کتابیں حوزہ کے نصاب میں شامل ہیں۔ ۱۲۳۱ قمری میں اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کا جسم مبارک شیخانِ قم میں دفن ہوا۔

''اے میرے مولا! مرزا ابوالقاسم کون ہیں؟''

امامؑ نے اپنے نورِ نگاہ کو اس کے رخسار پر ڈالتے ہوئے فرمایا:

''مجتہد اور مرجعِ تقلید ہیں''۔

''اے میرے مولا! میں نے یہ سفر بے پناہ سختی اور اندوہ کے ساتھ طے کیا ہے، مگر اب واپسی کے لیے میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ میں کس طرح قم جاؤں اور تھیلی ان سے لوں''۔

مولا نے نجف کے بازار کے کسی صرافِ[1] کا پتہ بتایا اور فرمایا:

''بازار چلے جاؤ اور اس سے بیس لیرا (وہاں کی کرنسی) مانگ لو''۔

بوڑھا شخص خواب سے جاگا۔ اس کی نگاہ چاند کی میٹھی نگاہ پر پڑی۔ ستارے اس کے لیے جھلمل کر رہے تھے۔ وہ پھر سو گیا۔

○

''جناب کوئی کام ہے؟''

''ہاں، ضمانت ہے مگر زبانی ہے''۔

صرّاف نے متانت سے پوچھا:

''کس قدر ہے؟''

بوڑھے نے حیرت سے کہا: ''بیس لیرا''۔

صرّاف مسکرایا اور بولا:

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔ کیا آپ قزوین کے رہنے والے ہیں؟''

''جی جناب۔ میں حج کرنے نکلا تھا۔ آپ نے کیسے جانا؟''

صرّاف نے بیس لیرا بوڑھے آدمی کے ٹھریا لے ہاتھ پر رکھ دیا۔

بوڑھے نے تعجب سے اسے دیکھا اور اس کے محبت پاش تبسم سے نظریں موڑتے

۱۔ صرّاف: وہ شخص جو مختلف ممالک کی کرنسی کا لین دین کرتا ہے۔ (Money Changer)

ہوئے بازار سے نکل گیا۔ اتنا حیران اور متعجب تھا کہ یہ نہ سمجھ سکا کہ کب صرّاف سے رخصت ہوا اور کب بازار سے باہر آ گیا۔

○

جب قم پہنچا تو ایک بار پھر رویا۔ چند ہفتوں کے سفر میں وہ بہت بے چین تھا۔ کئی بار سوچ میں پڑ گیا۔ اس کو اپنا خواب یاد آ جاتا تھا اور ہر وقت صرّاف کی شفاف نگاہیں اس کی نظروں میں پھرتی تھیں۔ برابر رنجیدہ خاطر ہوتا تھا اور فوراً ہی رونے لگتا تھا اور کہتا تھا:

''اے مولا! آپ پر قربان جاؤں۔ میرا یہ سفر کیسا تھا۔ میں نے خواب میں آپ کی اچھی طرح زیارت کیوں نہ کی۔ میں نے آپ کی بہشتی خوشبو کو استشمام کیوں نہ کیا۔ کیوں میں اس قدر چکرایا ہوا اور پریشان تھا۔ کیوں مجھے یقین نہیں ہوا کہ آپ تین رات میرے خواب میں تشریف لائے ہیں۔ ہر وقت اسی پیسہ کی تھیلی اور راہ کی دُشواریوں کی فکر میں اُلجھا رہا۔ اے میرے آقا! آپ کہاں ہیں، کہاں ہے وہ مردِ صرّاف جس کا آپ سے رابطہ تھا۔ آقا! کاش میں آپ کے دامن سے لپٹ جاتا اور آپ سے آخرت کی شفاعت کا طلبگار ہوتا۔ کاش کہ میں صرّاف کا مہمان ہوتا اور اس سے آپ کے ارتباط کا راز پوچھتا کاش...''

بوڑھا آدمی قم کی کچی اور قدیمی گلیوں میں چل پڑا۔ پہلے مولانا پر نظر پڑتے ہی گھبرا کے کہا:

''سلام آقا۔ مرزا ابوالقاسم قمّی کا گھر کدھر ہے؟ میں دور سے آیا ہوں''۔

مولانا نے گرمجوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا اور اس بوڑھے آدمی کو مرزا ابوالقاسم قمّی کے گھر کا پتہ بتا دیا جو کہ وہیں پاس میں تھا۔ دو چار گلیاں طے کرنے کے بعد مرزا کے گھر پہنچا اور اس کے اندر داخل ہوا۔ طلبا ایک بڑے کمرہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مرزا درس دے رہے تھے۔ بوڑھا آدمی بیٹھ گیا اور مرزا کے نورانی چہرے کو دیکھنے

لگا۔اپنے دل میں کہا:

''یعنی تھیلی مرزا کے پاس ہے۔اے میرے خدا میں خواب دیکھ رہا ہوں یا بیدار ہوں، خدا نہ کرے!...اب تھیلی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔اب مجھے اس عالم بزرگ کے راز سے واقف ہونا ہے''۔

مرزا کا درس ختم ہوتے ہی کمرہ خالی ہوگیا۔مرزا نے خندہ روئی سے بوڑھے آدمی کو سلام کیا اور پوچھا:

''کیا آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟''

بوڑھا آدمی ان کے قریب گیا، مرزا کے سلام کا جواب دیا اور ٹھہر ٹھہر کے اپنی سرگذشت بیان کرنے لگا۔ابھی اپنے سفر کی روئیداد بیان بھی نہ کرنے پایا تھا کہ رونے لگا۔کافی گریہ کرنے کے بعد اس نے تمام ماجرا مرزا کو سنایا۔مرزا اپنی جگہ سے اٹھے۔ اس کے چہرے کو چوما اور کہا:

''زیارت قبول ہو''۔

اس کے بعد کچھ بھاری کتابیں شیلف میں ہٹائیں۔بوڑھے کی طرف پلٹے اور ہاتھوں میں پیسہ لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

''آپ دیکھ لیں یہ سکّے ٹھیک ہیں''۔

بوڑھے کو تعجب ہوا۔یہ اسی کی تھیلی تھی۔اسے کانپتے ہاتھوں سے لیا اور سکّوں کو بعجلت تمام گنا۔ٹھیک تھا۔خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔حیرت و استعجاب سے مرزا کو دیکھا۔ان کے ہاتھ پیروں پر گر پڑا اور روتے ہوئے ان کو بوسہ دیا۔ایسا لگتا تھا کہ بیہوش ہوگیا ہے۔اس کا سر چکرا رہا تھا۔مرزا نے اسے شربت پلایا۔وہ بوڑھا آدمی ابھی بھی حیرت میں تھا اور اس کا دل دوسری دنیا میں سیر کر رہا تھا۔

○

اپنے شہر قزوین میں اس بوڑھے آدمی نے اپنی زوجہ کو شروع سے آخر تک ساری

داستان سنائی۔اس بوڑھی عورت نے اس پر یقین نہیں کیا، بوڑھے نے قسم کھائی۔

عورت نے پوچھا:

''پھر کیوں تم نے اس مہربان آقا کو چھوڑ دیا۔تم نے اس سے کیوں نہیں کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں قزوین جاؤں اور وہاں سے اپنی زوجہ کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آجاؤں تا کہ آپ کی خدمت کروں۔تم انہیں کیوں چھوڑ آئے؟''

بوڑھے نے سوچنا شروع کیا۔بوڑھی عورت اپنی جگہ سے اٹھی اور گھبراہٹ کے ساتھ کہا:

''اٹھو، اٹھو۔تا کہ دیر نہ ہو جائے۔ہم لوگ قم چلتے ہیں۔وہ مرد ہمارے مولا علیؑ کے خاص دوستوں میں سے ہے۔ہمیں اپنی تمام املاک و اسباب کو بیچ دینا چاہئے اور پھر اس آقا کی خدمت گذاری کے لیے ہم دونوں کو قم چلے جانا چاہئے، بس اب اٹھو کہ دیر نہ ہو جائے''۔

کچھ دن گزر گئے، اس بوڑھے آدمی نے اپنا کھیت باڑی اور گھر بیچ دیا۔دونوں نے خوشی خوشی ایک لمبی مسافت طے کی۔جس وقت وہ قم پہنچے شہر سیاہ پوش تھا۔ہر جگہ سے غم کی بو آرہی تھی اور گھروں کے اوپر نشانِ عزا لہرا رہا تھا۔گلی کوچوں اور محلوں میں ہر جگہ ماتم کناں جماعتیں موجود تھیں بوڑھے آدمی اور عورت کو حیرت ہوئی۔

بوڑھے آدمی نے ایک جوان عزادار سے پوچھا:

''کیا ہوا ہے؟ قم کیوں عزا میں ڈوبا ہوا ہے؟''

جوان نے دردبھرے انداز میں جواب دیا:

''ہم لوگوں کے عزیز آقا دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔مرزا ابوالقاسم قمی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں''۔

○○

جامع مسجد میں چور

رحمت یک چشم (کانے) نے جس وقت مسجد کی چھت سے گلی کی طرف رُخ کیا، ہیڈ کانسٹیبل کا دل ایک لمحہ کے لیے گھبرایا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت انگیز غصہ اُتر آیا۔ اس نے سوچا کہ رحمت کسی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ مگر رحمت کی طنزیہ ہنسی سے وہ بوکھلا گیا۔ چلانا چاہا لیکن ایسا نہ کرسکا۔ یعنی کچھ کہنے کا موقع و محل نہیں تھا۔ منہ بند رکھنے کی ضرورت تھی۔ رحمت یک چشم مسجد کی اونچی دیوار سے اوپر چڑھ گیا تھا، اور وہاں سے اپنے ہاتھ ہلا رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ پیشانی پر بل ڈال کر اپنے ڈنڈے کو جھٹکا دیا اور آہستہ سے چلایا:

"اے روباہ یک چشم! تمہیں کھیل سوجھ رہا ہے؟ دروازہ جلدی کھولو"۔

رحمت کے لاٹھی ڈنڈوں سے لیس کارندے، نصرت کی بیل گاڑی کے پاس کھڑے تھے اور دیوار پر پھیلے ہوئے اپنے لمبے سایہ کو دیکھ رہے تھے جو محلے کے پرانے حمام کی چمنی سے نکلنے والے دھوئیں کا ارتعاش کا تصور ذہن میں پیدا کررہا تھا۔ مسجد کی گلی کے نکڑ پر اصغر سپاہی کھڑا تھا تاکہ اگر کوئی مسجد کی طرف آئے تو اسے واپس کردے اور کوئی بھی آدھی رات کو مسجد کے قریب کھڑی گاڑی پر شک نہ کرے۔ ہیڈ کانسٹیبل میں کھڑے رہنے کی تاب نہ تھی۔ وہ رحمت کے انتظار میں تھا کہ وہ جلدی سے مسجد کے بڑے دروازہ کی زنجیر پیچھے کی طرف سے کھول دے۔

آج کی رات مسجد کا خادم مش علی محمد اپنی بیمار لڑکی کے گھر گیا ہوا تھا اور مسجد کو خدا کے حوالہ کرگیا تھا۔ شہر کے کوتوال اور ہیڈ کانسٹیبل کو اس بارے میں خبر ہوئی تو اپنی سازش کے لئے اس سے فائدہ اٹھایا۔ شہر کے کوتوال نے ہیڈ کانسٹیبل کو اس وقت شہر کی جامع مسجد بھیج دیا تھا جہاں سے چوری ہونی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل جو محلّہ کی مال گذاری وصول کیا کرتا تھا اس نے رحمت یک چشم اور اس کے دو تین بہادر غنڈوں کو اجیر کرلیا تھا تاکہ پروگرام بخوبی انجام پذیر ہوجائے۔

زنجیر کھول دی گئی۔ مسجد کے لکڑی کے دروازہ نے فریاد کی اور دیوار سے لگ گیا۔ سب سے پہلے ہیڈ کانسٹیبل مسجد کے آنگن میں داخل ہوا اور صحن کی طرف گیا۔ اگر دن ہوتا اور وہ اسی طرح جوتے پہنے ہوئے خانۂ خدا میں داخل ہوتا تو سب سے پہلا شخص جو سر دھڑ کی بازی لگا دیتا وہ مش علی محمد ہوتا۔

ہیڈ کانسٹیبل کے پیچھے پیچھے رحمت اور اس کے کارندے آنگن میں داخل ہوئے اور پھر جامع مسجد کے صحن میں گئے۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی مسجد کی جالی دار کھڑکیوں سے اندر آرہی تھی۔ صحن کی پوری فضا میں چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کسی کھڑکی کے پیچھے سے باہر نظر دوڑائی، نصرت گاڑی بان کو دیکھا کہ اپنی پرانی بیل گاڑی پر بیٹھا اونگھ رہا ہے، اصغر سپاہی بھی خبردار، آواز پر کان لگائے ہوئے گلی کے کونے پر کھڑا ہے تاکہ کوئی وہاں نہ آئے اور وہ لوگ اپنے کام کو جلدی تمام کرلیں۔

گلی میں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ رات بہت ہی سناٹی اور ڈراؤنی تھی۔ سفید بادلوں کے لمبے چوڑے ٹکڑے آسمان کو ڈھانپے ہوئے تھے اور اپنے اندر زبردست ٹھنڈک لیے ہوئے چھوٹے بڑے گھروں کے اوپر سے گذر رہے تھے۔

ہیڈ کانسٹیبل نے چند لمحوں میں ان تمام چیزوں پر نظر دوڑائی اور واپس پلٹ آیا۔ یہی وقت تھا۔ اپنی گھڑی کو دیکھا۔ گھڑی کے کانٹے وہی وقت بتا رہے تھے جس وقت کوتوال نے چوری کا حکم دیا تھا۔ اس وقت لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔

رحمت اور اس کے کارندے ہیڈ کانسٹیبل کے حکم پر کان لگائے ہوئے تیار تھے۔ ان تینوں کی آنکھوں سے خوف اور دہشت ٹپک رہی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اپنے ڈنڈے کو اپنے کمر بند میں پھنسایا۔ اپنی آستینوں کو جلدی سے اوپر چڑھایا اور سامان کی طرف بڑھا۔ رحمت اور اس کے کارندوں سے آہستہ سے کہا کہ سامان یہاں ہے۔ یہی ہے۔

رحمت اور اس کے کارندے برف کی طرح ٹھنڈے پڑ گئے۔ رحمت نے اپنی چھدری کھردری مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور بہت ہی احتیاط سے پوچھا:

''سامان یہ ہے، سرکار؟''

''یہ تو مولانا صاحب کا منبر ہے''۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اپنی تیز اور غضبناک آنکھوں سے اسے گھورا اور کہا:

''کیا تجھے احتشام السلطنت کے خزانہ کی خواہش ہے تاکہ تو اس میں سے اپنا حصہ لے جائے''۔

رحمت یک چشم نے ایک ہی گھونٹ میں اپنا تھوک حلق سے نیچا تارا، وہ بھی اتنی تیزی سے کہ اس کے گلے کی ہڈی دکھائی دینے لگی۔

مسجد کا لکڑی کا منبر زیادہ بڑا بھی نہیں تھا، نہ اس کے اوپر نقاشی کی گئی تھی نہ اس کا نوادرات میں شمار ہوتا تھا، نہ تو اس کے پایے اور اس کے اطراف میں سونا جڑا ہوا تھا۔ سر سے پیر تک بوسیدہ اور پرانی لکڑی کا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے آہستہ سے ہلا کر اس کا جائزہ لیا۔ اسے منبر ہلکا لگا۔ تھوڑا سا اسے اِدھر اُدھر کیا۔ مسجد کے پُرسکون صحن میں کھڑکھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے آہستہ سے کہا:

''جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے''۔

رحمت اور اس کے ملازم مسجد کے منقش محراب کی سمت رکھے ہوئے منبر کی طرف گئے۔ اس کو چاروں طرف سے پکڑا پھر منبر کو آہستہ سے وہاں سے اٹھایا۔ ہیڈ کانسٹیبل

دروازہ کی طرف بھاگا اور اسے پورا کھول دیا۔ رحمت یک چشم نے دل میں سوچا:

''یہ مونا نا ہیڈ کانسٹیبل بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہے۔ اس مسجد میں اتنا سارا قیمتی مال موجود ہے، لیکن وہ لکڑی کے بوسیدہ منبر پر نظریں گاڑے ہوئے ہے''۔

منبر بہت ہی آہستہ سے صحن تک لایا گیا۔ رحمت اور اس کے کارندوں نے ہیڈ کانسٹیبل کے اشارہ پر اسے دھیرے سے زمین پر رکھا۔ اچانک صحن کے ایک گوشے میں بالٹی کے لڑھکنے کی آواز نے سب کو بت کی طرح ساکت و جامد کر دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھا اور دیوار سے چپک گیا۔ رحمت کا کوئی کارندہ منھ دبا کے ہنسا اور سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ ایک کالی بلی دیوار کے اوپر تھی اور اپنی آنکھوں سے، جو دو نورانی بتّی کی طرح تھیں، مشکوک نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

ہیڈ کانسٹیبل نے غصہ سے اپنے دانت پیسے اور کہا:

''جلدی کرو''۔

پھر اپنے سر کو آنگن کے لکڑی کے بڑے دروازہ سے باہر نکالا، گلی کا اچھی طرح سے جائزہ لیا اور اشارہ کیا۔ رحمت اور اس کے کارندوں نے منبر کو دوبارہ اٹھایا اور مسجد سے باہر لے گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے نصرت گاڑی بان کی کمر پر زور سے ایک گھونسہ مارا۔ نصرت ڈر کے ماری نیند سے اچھل پڑا۔ اپنی کمر سیدھی کی۔ نیچے کودا اور رحمت اور اس کے کارندوں کی مدد کے لیے چل پڑا۔

منبر بڑی مشکل سے گاڑی پر چڑھایا گیا۔ رحمت اور اس کے کارندے گاڑی کے پیچھے جا کر منبر کے قریب بیٹھ گئے اور ہیڈ کانسٹیبل کے لبوں کی طرف دیکھنے لگے۔ نصرت نے پھٹی پرانی بدرنگ جوڑ پیوند والی ایک چادر بیل گاڑی کے اندر سے نکالی اور منبر کو اس سے ڈھانک دیا۔ اب جامع مسجد کے لکڑی کے سبز رنگ کا منبر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نصرت کانپتے ہوئے دوبارہ چاروں طرف کا اچھی طرح سے جائزہ لیا پھر اپنی بوڑھی گھوڑی کی طرف گیا۔ اس کی گردن کی ڈوری اور نکیل کھولی، اس کے پژمردہ ایال پر

ہاتھ پھیرا۔ بوڑھی گھوڑی نے بے حالی سے کان ہلائے۔

ہیڈ کانسٹیبل نے آہستہ سے مسجد کے دروازہ کو بند کیا۔ اصغر سپاہی اپنی پرانی سائیکل لایا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے رحمت اور اس کے کارندوں کی طرف رخ کر کے کہا:

''گاڑی پر یہیں مردہ کی طرح پڑے رہو، نہ ہلنا اور نہ کسی سے کچھ کہنا ورنہ بہت برا ہوگا۔ کوتوالی پہنچتے ہی تم لوگوں کی اُجرت ادا کر دی جائے گی''۔

پھر نصرت کو اشارہ کیا کہ ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ اصغر سپاہی اپنی سائیکل کی زین پر جا بیٹھا اور آرام سے چل پڑا۔ بھاری بھر کم تن وتوش والے ہیڈ کانسٹیبل کو اپنی سائیکل کے پیچھے بٹھایا پھر اپنا منہ بیل گاڑی کی طرف کیا۔ بیل گاڑی آہستہ آہستہ پکی گلیوں میں چل پڑی۔

ہیڈ کانسٹیبل کے دل نے تھوڑی راحت محسوس کی۔ اپنی ٹوپی کو اپنے سر سے اُٹھا کر پھر رکھا۔ اپنے پھولوں کے ٹھپّے والے رومال سے گردن کے چاروں طرف کا پسینہ پوچھا اور سوچنے لگا۔

''صبح ہوتے ہی منبر کو دیکھ کر کوتوال کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھے گا اور عقاب کی مانند اس میں طاقت پیدا ہو جائے گی۔ شیخ کا کام اب ختم ہے۔ جب منبر ہی نہ ہوگا تو نہ مجلس ہے، نہ نماز جماعت، نہ لوگوں کے شور وغل سے بھری جامع مسجد، ہمیں اس ضدی شیخ اور جامع مسجد سے نجات مل جائے گی۔ پھر کیا ہوگا وہ بعد کے پروگرام کے مطابق دیکھا جائے گا''۔

بیل گاڑی سانپ کی طرح آہستہ آہستہ بل کھاتی ہوئی ایک پتلی گلی میں داخل ہوئی اور دور ہوگئی۔ رحمت اور اس کے کارندے شدید ٹھنڈک کی وجہ سے منبر کے پاس کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

صبح ہو چلی تھی۔ آفتاب طلوع ہونے والا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کوئی بھی ستارہ اس اندھیرے میں جھلملا نہیں رہا تھا۔ جامع مسجد کے صحن کے

دروازے نماز کے لیے کھل گئے، مسجد کے بڑے بڑے چراغ صحن کو روشن کیے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ مسجد میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک آدمی چھت پر اذان دینے کے لیے گیا۔

مش علی محمد آہستہ آہستہ محراب کے پاس گیا، آقا کے ہرے مصلّے کو کھولا اور اسے ٹھیک سے بچھایا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پرندہ کی طرح شبستان میں داخل ہوئی اور اس کے پروں سے صبح کی دل پذیر خوشبو مسجد کے اندر پھیل گئی۔ مش علی محمد کھڑا ہوا، اپنے حلق کو صاف کیا تا کہ شبستان مسجد میں اذان کہے۔ اس نے روز کی طرح ایک ہاتھ اپنے کان پر رکھا اور بلند آواز میں کہا سُبْحَانَ اللّٰہ وَالْحَمْدُ لِلّٰہ۔

دفعتاً اس کی نظر منبر کی خالی جگہ پر پڑی۔ بے اختیار خاموش ہوگیا۔ منبر کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس کا رنگ متغیر ہوگیا۔ بڑی گھبراہٹ سے اذان دی اور اسی اضطرابی کیفیت میں وسیع وعریض صحن میں نظریں دوڑائیں، گویا منبر غائب ہوگیا تھا، اس کی آواز نحیف وکمزور ہوگئی تھی، نمازیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ صفوں کے بیچ سے لوگ حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ مش علی محمد نے بے دلی سے دوبارہ کہا: حَیَّ عَلیٰ خَیْرِ الْعَمَل۔

اب اس میں تاب نہیں تھی۔ غائب شدہ منبر کی فکر اسے کھائے جا رہی تھی۔ اچانک کسی نے سلام کہا۔ لوگوں نے دروازے کی طرف رخ کیا۔ نمازیوں نے مل کر انہیں سلام کیا اور درود پڑھا۔ یہ آقا شیخ[1] تھے جو لوگوں سے احوال پُرسی کر رہے تھے، اور پھر سیدھے محراب کی طرف چلے گئے۔ مش علی محمد نے بڑی مشکل سے اپنی اذان کے آخری جملہ کو دہرایا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔

۱۔ آقا شیخ: آیۃ اللہ العظمیٰ حاجی محمد علی شاہ آبادی سنہ ۱۲۹۲ قمری میں اصفہان میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۰ قمری میں مجتہد ہوئے۔ وہ اپنے زمانہ کے بزرگ عالموں اور عارفوں میں سے ایک تھے۔ آیۃ اللہ خمینی ان کے برجستہ شاگردوں میں سے تھے۔ مرحوم شاہ آبادی نے ۱۳۶۹ قمری تہران میں دنیا سے رحلت فرمائی۔

پھر وہ زمین پر گر پڑا اور اپنے سر کو زور زور سے پیٹنے لگا اور فریاد کی:

''غضب ہوگیا۔ اللہ کے گھر کا منبر کہاں گیا''۔

صفوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ آقا شیخ جو جانماز پر کھڑے تھے حیرت و استعجاب سے اسے دیکھ رہے تھے۔ مش علی محمد نے دوبارہ نالہ و فریاد کی:

''ارے افسوس کہ لوگ خانۂ خدا کے منبر کو چرا لے گئے۔ اللہ کے گھر میں چوری ہوگئی ہے''۔

سارے نمازی اُٹھ کھڑے ہوئے اور محراب کے قریب اسے گھیر لیا۔ آقا شیخ نے سب کو خاموش کرایا اور ان کو اپنی جگہ پر بیٹھایا اور مش علی محمد کو جو ابھی بھی نالہ کناں تھا منبر کی خالی جگہ کے قریب بٹھایا اور خوش رُوئی کے ساتھ نمازیوں کی طرف رُخ کر کے کہا:

''اس وقت منبر سے زیادہ اہم نماز ہے۔ ہم لوگ پہلے نماز با جماعت ادا کرلیں پھر گمشدہ منبر کا پتہ لگائیں''۔

پھر محراب کے قریب کھڑے ہوئے اور دلنشیں آواز میں نماز صبح کی اقامت کہنے لگے۔

نماز صبح کے بعد غم سے بوجھل آفتاب کے غروب ہونے تک مش علی محمد، بزرگ افراد اور محلّہ کے لوگ جہاں جہاں امکان تھا تلاش و جستجو میں لگے رہے، مگر لکڑی کے منبر کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ وہ منبر تھا جس پر آقا شیخ بیٹھ کر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے اور اس کے اوپر سے بغیر کسی خوف کے رضا خاں پر تنقید کرتے تھے۔ طلبا بھی خاص خاص وقتوں میں مسجد میں آتے تھے اور ان کے درس میں بیٹھتے تھے۔

مغرب و عشا کی نماز کے بعد مولانا صاحب محراب کے پاس کھڑے ہوئے۔ کافی تعداد میں لوگ مسجد میں آئے تھے۔ شام کے وقت کسی نے لوگوں کو خبر دی تھی کہ منبر کا چرانا حکومتی غنڈوں کا کام ہے تا کہ آپ کا درس، نماز اور موعظہ بند ہو جائے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ آقا شیخ کی لوگوں کے سامنے اپنی آخری

وعظ و نصیحت بیان کرنا چاہتے ہیں اور اس کے بعد جامع مسجد اور لوگوں سے خدا حافظی کرلیں گے۔

لوگوں کے دلوں میں ہیجان برپا تھا۔ آقا شیخ اپنی زبان پر خدا کا نام لائے اور گلاب کی خوشبو کی طرح اس شبستان کو معطر کردیا۔ پھر ایک شیرین و سادہ ہنسی ہونٹوں پر آئی۔ لوگوں کو تعجب ہوا۔ آقا شیخ نے فرمایا:

''اب جب کہ منبر نہیں ہے تو میں پہلے کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی گفتگو کروں گا''۔

لوگوں نے اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنا شروع کیا۔ آقا شیخ نے پہلے سے زیادہ پُرزور طریقہ سے دوبارہ یہ بات دہرائی کہ اگر ان لوگوں کی تمنا ہے کہ میرے درس اور تقریر کو معطل کردیں تو انہیں چاہیے کہ میرے پاس آئیں اور مجھے چُرا کر لے جائیں نہ کہ خانۂ خدا کے بے زبان منبر کو۔

لوگوں نے بے اختیار اور ہیجان زدہ ہو کر صلوٰۃ پڑھنی شروع کردی اور ان کے شانہ بشانہ عورتوں نے بھی صلوٰۃ پڑھی۔ ان لوگوں کے درمیان سے ایک آدمی نے زور سے کہا کہ محلّہ کے لوگوں کے تعاون سے آقا شیخ کے لیے ایک نیا منبر تیار کیا جائے گا۔

دوبارہ زور شور سے صلوٰۃ پڑھی گئی۔ آقا شیخ نے اپنی گھنی کھچڑی گندمی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بہت ہی مضبوط آواز میں کہا:

''میں آج کے بعد آپ کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کروں گا اور میری تقریر پہلے سے زیادہ لمبی ہوگی۔ روزانہ صبح کی اذان سے پہلے میں گھر سے تنہا مسجد آؤں گا۔ اگر رضا خاں کے نوکروں میں ہمت ہے تو آئیں اور مجھے گرفتار کریں''۔

پے در پے صلوٰۃ کے فلک شگاف نعروں سے صحن کونج اٹھا اور اَدھ کھلی کھڑکیوں سے صلوٰۃ کی آواز مثل نسیم باہر نکل گئی۔ مش علی محمد کو اب افاقہ ہوگیا تھا اور وہ صفوں کے درمیان سے ہوتا ہوا محراب کے کنارے کھڑا ہوگیا۔

ایک دُبلے پتلے جسم کا ادھیڑ عمر کا آدمی جو شبستان کے دروازہ کے بغل میں بیٹھا ہوا تھا، آہستہ سے کھسکتا ہوا شبستان سے باہر نکلا، اپنے جوتوں کو چپکے سے پہنا اور سیدھے کوتوالی کی طرف دوڑ کر بھاگا۔

○○

امامِ زمانؑ کی رعیت

جوان سپاہی نے لکڑی کے وزنی دروازہ کو ایک طرف ہٹایا اور ان تینوں نئے آنے والے لوگوں پر نظر ڈالی۔ خوش پوشاک مرد آگے بڑھے اور حسین صاحب[1] کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ جوان سپاہی نے اپنی ٹوپی کو ٹھیک کیا۔ اپنی بندوق کے چمڑے کے تسمہ کو اپنے شانہ پر پھیلایا اور کہا:

''آقا نے کہا ہے کہ اندر تشریف لائیے''۔

وہ سبھی لوگ اپنے دھوپ والے چشمے کے پیچھے سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسے پھر اپنی عینک کو آنکھوں سے ہٹالیا۔

جوان سپاہی بالکل سیدھا دیوار کے کنارے کھڑا ہوگیا اور جذبات سے عاری آنکھوں کو ان لوگوں پر ٹکا دیں جو صاحب منصب معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے دو لوگ سوٹ پہنے ہوئے اور ہیٹ اور ٹائی لگائے تھے۔ تیسرا شخص جو پستہ قد اور موٹا تھا، لمبی چوڑی برساتی پہنے ہوئے تھا اور سر پر ہیٹ تھی۔ گھنی اور لٹکی ہوئی مونچھیں اس کے

۱۔ جناب حسین صاحب: آیت اللہ العظمیٰ حاج آقا حسین قمی ۱۲۸۲ قمری قم میں پیدا ہوئے۔ قم میں حوزہ کے درس کا آغاز کیا اور بہت جلد مجتہد ہوگئے، پھر ۱۳۳۱ قمری میں مشہد چلے گئے اور اس شہر کے حوزہ علمیہ کے سرپرست ہوئے۔ جوانی سے ہی ارباب حکومت اور طاغوتی افراد سے نبرد آزما رہے، اور انجام کار ۱۳۶۶ قمری میں راہیٔ ملک عدم ہوئے اور کربلا میں تدفین ہوئی۔ وہ رضا خاں کے زمانہ میں گوہرشاد مسجد کے قیام کے رہبر تھے۔

سیاہ ہونٹ پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ لوگ حکومت کی طرف سے حاج آقا حسین کے لیے کوئی پیغام لائے تھے۔

شہر ری میں حسین صاحب کا گھر کچھ دِنوں سے خود رضا خاں کے حکم سے پولیس انتظامیہ کے گھیرے میں تھا اور کسی کو ان کے گھر میں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جب سے حسین صاحب عتباتِ عالیہ[1] سے ایران واپس آئے اور لوگوں کو حکومت کے خلاف ورغلایا، شاہ ان سے خائف تھا، خاص طور سے جب سے حاج آقا حسین کی سرپرستی میں مشہد کی گوہر شاہ مسجد میں بہت بڑا مظاہرہ ہوا تھا جس سے حکومت کے پیر اُکھڑ گئے، یہ خوف اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔

اس وقت یہ تینوں لوگ ایک اہم ترین کام کے لیے شیعوں کے مرجعِ تقلید حاج آقا حسین سے ملنے آئے تھے۔

ان میں سے ایک نے دوسرے سے آہستہ سے کہا:

''ہم لوگ یقیناً یہاں سے اپنا مقصود حاصل کر کے پلٹیں گے۔ یہ سیّد تو فی الحال اعلیٰ حضرت کی قید میں ہے، ہم لوگ جو بھی کہیں گے وہ اسے قبول کرے گا''۔

ان میں سے دوسرا شخص جس کی داڑھی مونڈی ہوئی تھی اور اس کی ناک کے اوپر سیاہ تل تھا مسکرایا اور کہا:

''سب جھگڑے پیسے کی وجہ سے ہیں جب پیسے کا نام آتا ہے...''

پھر ہنسنے لگا۔

وہ تینوں ایک پتلے دالان میں داخل ہوئے۔ حاج آقا حسین کا بوڑھا خادم آہستہ آہستہ ان کے استقبال کے لیے آیا اور انہیں سلام کیا لیکن انہیں اپنے ہونٹ ہلانے میں بھی زحمت محسوس ہوئی۔ بوڑھے خادم نے غصہ اور تعجب سے انہیں دیکھا اور کہا:

۱۔ عتبات عالیہ: ائمہ معصومینؑ کے حرم اور متبرک مزارات جو عراق میں ہیں۔

''میرے پیچھے پیچھے آیئے''۔

پھر وہ اندرونی کمرہ میں گیا۔ ان میں سے ایک آدمی جوتا پہنے ہوئے کمرہ میں داخل ہونا چاہا لیکن دوسرے شخص نے اس کے پہلو پر ٹہوکا لگایا اور دھیرے سے کہا:

''جوتے؟ اپنے جوتوں کو اُتارو۔ یہ محل نہیں ہے''۔

تینوں نے ہنستے ہوئے اپنے جوتوں کو اُتارا۔ بوڑھے خادم نے بڑی کراہت سے ان کے جوتوں کو دروازے کے قریب سیدھا کر کے رکھا اور کہا:

''اوپر تشریف لایئے''۔

وہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے اور بوڑھے خادم کے کہنے پر کمرہ کے چھوٹے اور سادہ گاؤتکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کمرہ میں کوئی نہیں تھا۔ سفید رنگ کے دروازہ کی طرف نظر دوڑائی جو دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ بوڑھے خادم کے دل میں ان کی طرف سے نفرت کا ایک شعلہ بھڑک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ دوبارہ کسی نئی سازش کے تحت یہاں آئے ہیں۔ بوڑھا خادم برداشت نہ کر سکا اور کمرہ سے باہر چلا گیا۔

ان میں سے ایک آدمی نے جو عمر دراز اور شکل وصورت میں کالا بھجنگ تھا، آہستہ سے اپنے دوستوں کی طرف منھ کر کے کہا:

''یہ سیّد خود کو لوگوں کا مالک سمجھتا ہے مگر نہ تو ڈھنگ کا ایک گھر ہے نہ پیسہ ہے اور نہ ہی مال و اسباب، یہاں تک کہ جو مال و اسباب ہے وہ بھی دقیانوس کے زمانہ کا ہے''۔

برساتی پہنے ہوئے شخص نے کمرہ میں بچھے گھسے ہوئے فرش پر ہاتھ پھیرا اور اسی پھیکی بناوٹی ہنسی کے ساتھ کہا:

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، کچھ لمحوں کے بعد''۔

اندرونی کمرہ کے لکڑی کے دروازہ کے کھلنے کی آواز پیدا ہوئی۔ ایک نوجوان طالب علم کالا عمامہ لگائے ہوئے کمرہ کے اندر آیا۔ سلام کیا اور مشکوک نظروں سے ان

تینوں اشخاص کو دیکھا۔ وہ لوگ مبہوت و حیران ہوکر بے اختیار کھڑے ہوگئے۔ بوڑھا خادم دروازہ کی طرف لپکا اور پردہ کو ایک طرف کیا۔ حسین صاحب کے نورانی چہرے نے ان کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچا۔ تینوں اشخاص کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ حسین صاحب کی تیز اور راٹر دار نظروں نے ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہ لوگ قریب گئے، سلام کیا۔ جھکے اور پھر سیدھے کھڑے ہوگئے۔ حسین صاحب نے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرش پر بیٹھ گئے۔ وہ لوگ بھی بیٹھ گئے۔ بوڑھے خادم نے حسین صاحب کی پیٹھ کے پیچھے سفید تکیہ کو ٹھیک کیا۔

حسین صاحب جلدی جلدی سانس لیتے ہوئے اپنی گھنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں اضطراب کی بجلی کوند گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ حسین صاحب کی ہیبت ناک نگاہ اور برتاؤ سے خوفزدہ ہوگئے ہیں۔

برساتی پوش آدمی نے کھنکھناتی آواز میں حسین صاحب کی احوال پرسی کی۔ حسین صاحب نے اپنے سر کے اوپر آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کالے بھجنگے آدمی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر اس کا ہاتھ اسی جگہ اٹک گیا اور باہر نہیں نکلا۔ اس کی بغل میں کھڑا ساتھی جو اس کا منتظر تھا اپنے ہونٹوں کو حرکت دی اور کہا:

''ظاہر ہے اس چھوٹے سے تنگ گھر میں حضرت عالی کے آرام کا سامان فراہم نہیں ہے۔ ہم اس سختی کے ختم ہوجانے کی خوشخبری دینے آئے ہیں''۔

حسین صاحب نے غضبناک ہوکر انہیں دیکھا اور کہا:

''ہم قانع اور شاکر ہیں۔ ہمارا آرام وسکون خدا کے ہاتھ میں ہے نہ کہ دوسروں کے ہاتھ میں''۔

اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا دوسرا شخص جو ابھی بھی جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا، دوسرے ہاتھ سے اپنی پیشانی کا پسینہ پوچھا، پھر اپنے ہاتھ کو باہر نکالا۔ پھیکی سی ہنسی ہنسا اور ایک سفید کاغذ حاج آقا حسین کے سامنے رکھا اور کہا:

''جناب والا! یہ بلینک چیک اعلیٰ حضرت کا ہدیہ ہے۔ جتنی رقم آپ چاہیں اس چیک میں لکھ لیں اور شاہی بینک سے وصول کرلیں''۔

مرد اپنی بات کو آگے بڑھانا چاہتا تھا کہ حسین صاحب نے پہلے سے بھی زیادہ غضبناک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر اپنے عصا کو ہاتھ میں لیا اور غصے میں کہا:

''میں نے سرکاری پیسہ کی کبھی بھی خواہش نہیں کی۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر شاہ خود یہاں آئے اور ایک ملین تومان بھی لائے تو بھی میں اسے قبول نہ کروں، یہ محال ہے''۔

وہ تینوں مرد تھک ہار کر پیچھے ہٹ گئے۔ جوان طالب علم اور بوڑھے خادم مسکرانے لگے۔ برساتی پوش آدمی نے منمناتے ہوئے کہا:

''کافی دنوں سے آپ محاصرہ میں ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ اعلیٰ حضرت کے اس پیسے کو قبول فرمائیں اور ہم پر احسان کریں''۔

حسین صاحب کو پہلے سے زیادہ غصہ آیا مگر کہا کچھ نہیں اور ان لوگوں کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ فوراً ہی اپنے عصا کا سہارا لیا اور کھڑے ہوگئے۔ جانا چاہا مگر ضبط نہ کرسکے اور غصہ سے کہا:

''میں امامِ زمانہؑ کی رعایا میں سے ہوں، میں اس بزرگ کا نوکر ہوں جو اپنے پیسوں کو خود میرے لیے بھیجتے ہیں، اور اب تک میرے تمام اخراجات کو امامِ زمانہؑ نے مرحمت فرمایا ہے، اور اس کے بعد بھی وہ مجھے فراموش نہیں کریں گے۔ چلے جاؤ اور اپنے بادشاہ سے کہہ دو''۔

پھر ان لوگوں کی طرف سے رُخ پھیرا اور اندر والے کمرہ میں چلے گئے۔ جوان طالب علم بھی ان کے پیچھے ہولیا اور دروازے کو بند کردیا۔ بوڑھا خادم ان تینوں کے سامنے کھڑا ہوا اور ان کی بگڑی ہوئے اور مضمحل صورت کو دیکھنے لگا۔ وہ تینوں غصہ میں

کھڑے ہو گئے۔ برساتی اوڑھے ہوئے آدمی نے اپنی ناک ڈھیلی کی۔ اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھا اور چڑچڑے پن سے اپنے دوستوں سے کہا:

''چلو، یہاں ہماری جگہ نہیں ہے''۔

تینوں کمرہ سے باہر چلے گئے۔ بوڑھے خادم کی آنکھوں میں ایک خوشگوار خوشی جھلک رہی تھی۔ صحن کے دروازہ تک ان لوگوں کے ساتھ ساتھ گیا۔ سپاہی جوان لوگوں کے لیے تعینات تھا کھڑا ہو گیا۔ تینوں اشخاص نے غصہ سے آپس میں کچھ باتیں کیں اور گلی کے نکڑ پر ان کے انتظار میں کھڑی سیاہ گاڑی کی طرف چلے گئے۔

○

جب داروغہ کے کانوں تک یہ خبر پہنچی تو پہلے ہنسا اور اس قدر ہنسا کہ لوٹ پوٹ ہو گیا۔ پھر اپنے ایک خفیہ آدمی کی طرف دیکھا جو جوان تھا اور سادہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ پھر گھبرایا ہوا پوچھتا ہے:

''جناب کی طبیعت کیسی ہے؟''

جوان کارندے نے چہک کر جواب دیا:

''اچھی ہے۔ صرف وہ ملک کے حالات سے تھوڑا آزردہ خاطر ہیں اور رضا خاں سے تو بہت زیادہ''۔

داروغہ اپنی میز سے اُٹھا۔ اپنے یونیفارم کو صاف کیا اور کھڑکی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ افرا اور سرو کے درختوں کو غور سے دیکھتا رہا، پھر پلٹا اور رضا خاں کی قد آدم تصویر پر غصے سے نظر ڈالی اور اپنے ہونٹوں کو چبایا۔ پھر ایسا لگا گویا اس کے ذہن میں کوئی تازہ خیال آ گیا ہو۔ مسکرایا اور جوان کارندے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھا اور کہا:

''تم جلدی سے جناب کے گھر جاؤ اور کہہ دو کہ میں ایک گھنٹہ میں وہاں آ رہا ہوں، جاؤ''۔

کارندے نے فوراً ہی خدا حافظ کہا اور روانہ ہو گیا۔ داروغہ نے دروازہ کو مقفل کیا، پھر اپنی میز پر رکھے سیاہ دستہ والے فون کی طرف گیا۔ اس کا ہینڈل کو گھمایا اور کہا:

''اس نمبر کو ملاؤ''۔

اس کا ذہن و دل معمول سے زیادہ آسودہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس طریقہ سے بھی حسین صاحب کی خدمت کر سکتا ہے تا کہ خدا کو پسند آئے۔ ان چند دنوں میں جب حسین صاحب کا گھر محاصرہ میں تھا، مذہبی اور نرم دل افراد کو گھر کے چاروں طرف لگا رکھا تھا اور جہاں تک ممکن ہو سکا ملاقات اور دوسرے امور میں گھر کے لوگوں کو راحت دیتا رہا۔ مگر یہ تمام کام خاموشی سے اور خفیہ طریقہ سے انجام پاتے رہے تا کہ رضا خاں اور اربابِ حکومت کو اس کی بھنک تک نہ لگ سکے۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اپنے اس آخری راستہ سے جو اس کے ذہن میں آیا تھا حسین صاحب کی مدد کر کے اور امامِ زمانہؑ کے دل کو خوش کرے۔ چل پڑا اور سرکاری گاڑی میں جا بیٹھا۔ موٹر کچھ سڑکوں کو تیزی سے پیچھے چھوڑتی ہوئی حسین صاحب کے گھر کے دروازہ کے پاس جا کر رُک گئی۔

وہ گاڑی سے نیچے اترا۔ گھر کے قریب کچھ سپاہی اس کو دیکھ کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ اس نے خود کو ٹھیک ٹھاک کیا، دروازہ کے پاس گیا۔ دروازہ کی زنجیر ہلائی، دروازہ کھلا، بوڑھے خادم کی نگاہ اس پر پڑی، خوشی سے جھوم اُٹھا، سلام کیا اور اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے دروازہ کو آخر تک پورا کھول دیا، پھر گھر کے اندر چلا گیا اور فوراً ہی واپس ہوا اور ادب سے کہا:

''جناب اندر تشریف لائیے''۔

وہ گھر کے اندر گیا۔ بوڑھے خادم نے دروازہ بند کیا۔ اس نے خوشی خوشی اپنے جوتے کو اُتارا اور بیتابانہ اندر کے کمرہ میں داخل ہوا۔ حسین صاحب کو دیکھتے ہی، زوردار سلام کیا۔ حسین صاحب سفید لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھے اور اپنے سر پر سفید گول ٹوپی ڈال رکھی تھی۔ محبت آمیز لہجہ میں جوابِ سلام دیا، پھر سیاہ عمامہ کو اپنے سر پر

رکھا اور کھڑے ہونا چاہا لیکن داروغہ فوراً ان کے قریب بیٹھ گیا۔اس نے ان کے ہاتھوں کو گرمجوشی سے پکڑنا چاہا تا کہ بوسہ دے مگر حسین صاحب نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ داروغہ نے حسین صاحب کی احوال پرسی کی ۔ بوڑھے خادم نے تازہ چائے اس کے پاس لاکر رکھی اور کمرہ سے باہر چلا گیا۔

افسر نے اپنے موزے کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک بنڈل باہر نکالا۔حسین صاحب کے ہونٹوں پر ابھی بھی شیریں و پدرانہ مسکراہٹ تھی۔اس نے پیسہ کا بنڈل ان کے قریب رکھا۔کافی پیسہ تھا۔حسین صاحب نے تعجب سے پیسوں کو دیکھا۔

داروغہ نے اپنی ہمیشہ کی عقیدت مندی سے کہا:

''یہ وجوہات شرعیہ[1] کی رقم ہے جسے چھپا کر تہران کے مومنین کی طرف سے لایا ہوں''۔

حسین صاحب نے پرسکون انداز میں اس پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا:

''مجھے اطمینان تھا کہ امامِ زمانہؑ ایسے خاص وقتوں میں اپنی رعیت کو تنہا نہ چھوڑیں گے۔اس نے خوش ہوکر نقل کے دانے منہ میں رکھے اور خوش رنگ چائے کو مزہ لے لے کر پیا''۔

○○

۱۔ وجوہات شرعی: وہ رقم جو مسلمان اپنے مال کے خمس کے ضمن میں اپنے مرجع تقلید کو دیتے ہیں۔اس کے احکام رسالہ ہائے احکام میں مندرج ہیں۔

سُرخ انار کا راز

دربان ایک قطار میں سینہ پر ہاتھ رکھے ہوئے ایک دوسرے کے پاس کھڑے ہوگئے۔ کارندوں نے محل کے منقش اور بھاری پردہ کو اُوپر اُٹھایا اور خود دروازہ کے ایک طرف کھڑے ہوگئے۔

وزیر محل کے پتھر کی سیڑھیوں سے ہوتا ہوا جلدی سے اوپر چلا گیا اور بغیر رکے ہوئے اپنے قوی ہیکل جسم کو محل تک پہنچادیا۔حاکم کا پیشکار کمر تک جھکا اور اس کے خوش آمد کہنے سے قبل وزیر اس کے قریب سے گزر گیا اور محل کی محرابدار گزرگاہ کے چند ستون سے آگے بڑھا اور حاکم کے محل پر کھڑے آخری دربان سے ملاقات کی۔تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔سوکھی کھانسی کھانسا۔جب تک دربان محل کے اندر جائے اور واپس آئے انہیں چند لمحوں میں وزیر نے اپنے ہاتھ میں ایک کپڑے کے ٹکڑے میں لپٹی ہوئی چیز کو طنز آمیز ہنسی کے ساتھ دیکھا اور اس کا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔

دربان نے زوردار آواز میں کھینچ کر کہا:

''حاکم نے اجازت دے دی ہے''۔

وزیر نے محل میں قدم رکھا اور بآواز بلند سلام کیا۔حاکم کی تعریف میں چند کلمات ادا کیے پھر حاکم کے اور قریب چلا گیا۔

حاکم بے حال و پریشان اپنے بھاری بھرکم جسم کو سرخ مخمل والے آرام دہ تخت پر ڈالے ہوئے تھا۔اس کا چہرہ سرد اور بے روح تھا۔

وزیر جھکا اور فوراً ہی بولا:

''میرے مالک میں لایا۔ میں اپنی سچائی، حقانیت اور صداقت کی روشن ترین نشانی لایا ہوں''۔

حاکم نے تعجب سے اپنی آنکھ بھنوئیں چڑھائی اور ہونٹوں کو دبایا۔ وزیر نے کپڑے کی تہوں کو دھیرے دھیرے کھولا۔

سرخ رنگ کا بڑا سا انار تھا۔ حاکم زیادہ حیران ہوا، وزیر نے بڑی چالاکی سے انار کو کئی مرتبہ کبھی اِس ہاتھ میں اور کبھی اُس ہاتھ میں لے کر خوب گھمایا۔ انار کی جلد پر کچھ اُبھرا ہوا تھا۔ حاکم چونکہ تھوڑے فاصلہ پر تھا اس لئے اسے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ:

''ایسی کیا بات ہے، انار میں ایسا کیا راز ہے کہ ہم اس سے بے خبر ہیں، اور یہ وزیر جو ہم سے کمتر ہے اس سے باخبر ہے''۔

وزیر حاکم کی متعجب نگاہوں کے سامنے انار کو لایا اور ایک مرتبہ پھر بڑے آرام سے اسے گھمایا۔ حاکم صرف اتنا ہی سمجھ سکا کہ انار کی جلد پر کچھ لکھا ہوا ہے۔

وزیر نے دوسری مرتبہ پھر بہت ہی چالاکی سے انار کو گھمایا اور کہا:

''پڑھئے''۔

حاکم نے اپنی نگاہیں گاڑیں اور پڑھا: لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ابوبکر، عمر وعثمان وعلی خلفاء رسول اللہ۔

حاکم کی نگاہوں میں بجلی سی کوند گئی۔ جیسے بغیر چاند والی کالی اندھیری رات میں بڑی سی بلّی کی آنکھوں کی چمک۔ حاکم نے وزیر کے ہاتھوں سے انار کو اُچک لیا اور اچھی طرح اُلٹا پلٹا، اُچھالا پھر بہت ہی احتیاط سے انار کی جلد پر اُبھرے ہوئے حروف پر اپنی انگلی کی نوک کو پھرایا۔ اس کے لیے یہ ناقابلِ یقین تھا کہ بغیر اس کے کہ انسانی ہاتھ ان حروف کو انار کی جلد پر کندہ کرے، انار کی جلد پر فطری انداز میں نقش تراشیدہ تھے۔

حاکم نے اپنے ہونٹوں کے گوشوں کو چبایا اور بلند آواز میں کہا:

''واہ! بہت ہی تعجب خیز ہے۔ اللہ اکبر!''

وزیر نے ماہرانہ انداز میں انار کو حاکم کے ہاتھ سے لے لیا۔ ایک لمبی ہنسی ہنسا اور ٹہلتے ہوئے کہا:

''میرے سردار آپ نے دیکھا، یہ خداداد انار اور یہ آسمانی نوشتہ''۔

حاکم اپنے تخت سے تیزی کے ساتھ اُٹھا اور وزیر کے پیچھے، جو چہل قدمی کرتے ہوئے چلا جا رہا تھا، چل پڑا اور کہا:

''یہ انار شیعوں کے مذہب کے بطلان پر ایک روشن نشانی اور محکم دلیل ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے...''

وزیر نے قہقہہ لگایا اور کہا:

''ہاں میرے مالک، ہاں''۔

حاکم نے انار کو دوبارہ لیا، اسے چاروں طرف سے اچھی طرح دیکھا، پھر اسے سونگھا اور پوچھا:

''اس وقت ہماری مملکت، بحرین کے لوگوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

وزیر نے سوچ میں ڈوبی ہوئی صورت بنائی اور اپنی چھدری داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بغیر کسی تمہید کے کہا:

''وہ کچھ متعصب لوگ ہیں جو ہمارے براہین و دلائل کو رد کرتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ان کے بزرگوں کو اپنے پاس بلایئے اور اس انار کو انہیں دِکھلایئے۔ اگر وہ قبول کرتے ہیں اور اپنے باطل مذہب سے دست بردار ہو جاتے ہیں تو بہت اچھا، کیونکہ یہ ان لوگوں کے لیے ثواب اور آخرت میں اجرِ عظیم کا حامل ہوگا۔ اور اگر اپنے عقیدہ سے دست کش نہیں ہوتے ہیں اور اپنی

گمراہی پر ڈٹے رہتے ہیں...''

حاکم جو کہ گردن اُٹھائے ہوئے تھا اور اس کی سوالیہ نگاہیں وزیر کے ہونٹوں پر مرکوز تھیں پوچھا:

''پھر''۔

وزیر نے مسکراتے ہوئے کہا:

''معلوم ہے ان لوگوں کے پاس تین راستے ہیں، یا ذلت وخواری سے جزیہ ادا کریں، یا اس آسمانی نعمت کی رد میں کوئی جواب پیش کریں، جو کہ ان کے پاس نہیں ہے، یا یہ کہ آپ حکم دیں کہ ان کے مرد قتل کیے جائیں، ان کی عورتیں اور بچے قیدی بنائے جائیں اور ان کا مال و اسباب مالِ غنیمت میں لے لیا جائے''۔

حاکم ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ باہر کونکلی کول مٹول توند میں ہنسی سے بل پڑ گئے، اور اس کے ہنسنے کی آواز قصر کے پختہ کنگروں کے نیچے تک سنائی دے رہی تھی۔ پھر کہا:

''وزیر کتنا ہوشیار ہے۔ میں یہی کروں گا، آج ہی...''

○

وہ انار شیعہ بزرگوں اور علماء دین کے ہاتھوں ہاتھ گھومتا رہا۔ سب نے حیرت ظاہر کی اور ان کی پیشانی پر سرد پسینہ آ گیا۔ پانچوں لوگ فکر میں ڈوب گئے۔ حاکم طنزیہ ہنسی ہنسا اور وزیر کو جو سراپا شوق بنا ہوا تھا کنکھیوں سے دیکھا۔ وزیر کا دل خوشی سے اُچھل رہا تھا، گویا پر لگ گئے تھے۔

حاکم نے ایک قدم بڑھایا، مگر دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں پھنسا کر دبایا، دانت پر دانت رکھ کر پیسا اور تیوری چڑھاتے ہوئے کہا:

''اگر اس سرخ انار کی بابت تشفی بخش جواب نہیں لائے تو تمہارے مردوں کو قتل کر دوں گا اور بچوں، عورتوں کو قیدی بنالوں گا اور تمہارے مال کو

تاوان میں لے لوں گا، یا یہ کہ بھاری جزیہ ادا کیا جائے''۔

بزرگانِ شیعہ حیران رہ گئے۔ کسی کے ذہن میں نہیں آیا کہ حاکم کے جواب میں کچھ کہے۔ ان میں سے دو ایک تو حاکم کی ڈانٹ پھٹکار سے بری طرح خائف و ترساں تھے۔

وزیر نے بہت غرور سے ہر ایک پر طنز کیا اور اپنی تمسخر آمیز نگاہوں سے ان کی تحقیر کی۔

ان میں سے ایک بوڑھے شخص نے، جس کی کمر جھکی ہوئی تھی بقیہ ساتھیوں سے مشورہ کیا پھر خود حاکم کے قریب آیا اور بڑے اطمینان سے حاکم سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے امیر! ہمیں تین دن کی مہلت دو شاید ہم اس کا جواب لے آئیں جس سے آپ مطمئن ہو جائیں۔ اگر جواب نہ لا پائیں تو جو کچھ آپ چاہیں انجام دیں''۔

حاکم ہنسا۔ اس کے تمام غیر متناسب دانت دکھائی دینے لگے۔ وزیر بھی بہت ہی آرام اور تکلیف دینے والے انداز میں ہنسا۔ حاکم نے ان لوگوں کو تلاش و تحقیق کی مہلت دے دی۔

وہ سب لوگ محل سے جلد ہی باہر نکل گئے۔ اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے تا کہ سب لوگ ایک جگہ جمع ہو کر جس قدر جلد ہو سکے حاکم اور وزیر کے اس بڑے فتنہ کا حل تلاش کر سکیں۔

○

صلاح و مشورہ کے بعد بزرگانِ شیعہ نے پہلے یہ طے کیا کہ بحرین کے دس متقی اور پرہیز گار بزرگوں کا انتخاب کیا جائے۔ تحقیق و تلاش کے بعد یہ کام اسی روز انجام پایا۔ ایک آدمی نے ان دس لوگوں کے نام لکھے اور لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔

پھر یہ رائے ہوئی کہ ان دس آدمیوں میں سے تین بہترین لوگوں کو تین راتوں کے لیے چنا جائے۔ ان تین لوگوں کا بھی انتخاب کر لیا گیا اور ان کے نام الگ کاغذ پر تحریر کیے گئے۔

ایک بزرگ نے دوسرے لوگوں سے کہا کہ پہلے پرہیزگار شخص کو بلایا جائے اور اس سے پورے واقعہ کو بیان کیا جائے، اور یہ طے پایا کہ آج ہی رات وہ اپنا کام شروع کردے۔

لوگوں نے صلوٰۃ پڑھی، کمرے کی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہوئی اور وہاں موجود لوگوں کے تمتماتے چہروں کو ٹھنڈا کیا۔ وہ چھوٹا کمرہ جس میں وہ سب اکٹھا تھے بحرین شہر کے باہر تھا۔ حکومت کے کارندوں کی نگاہوں سے دور ایک چھوٹے سے نخلستان کے بیچوں بیچ۔

ابوخلیل نامی ایک بلند قامت جوان کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ ایک گھوڑا لیکر پہلے متقی اور پرہیزگار شخص کے گھر جائے۔

''ابوخلیل احتیاط سے کام لینا۔ جلدی واپس ہونا''۔

ابوخلیل نے دیر نہیں کی اور پہلے بحرینی مردصالح کو لانے کے لیے ایک گھوڑے کی طرف گیا۔ کمرے میں موجود بزرگوں کی آنکھیں بیچین تھیں۔ وہ انجام کار کی بابت بے چینی سے سوچ رہے تھے۔

○

تمام بزرگ چٹائی کے تکیوں پر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پہلے متقی آدمی نے ان کی باتیں سننے کے بعد پکا ارادہ کیا، ان لوگوں سے جدا ہوا اور حیران و پریشان تن و تنہا بیابان کی سمت چل پڑا۔

اس رات آسمان اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود اس کی نظروں سے پنہاں تھا۔ پرہیزگار آدمی زیارت کی فکر میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کے موٹے موٹے قطرے چمک رہے تھے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک پہاڑی کے نیچے رکا۔ اس کے پیر سست پڑ گئے اور بیابان کی گرم خاک پر گر پڑا۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ جنگل تھا اور ستاروں بھرا خاموش آسمان۔

مگر وہ ڈر نہیں رہا تھا۔ وہ صرف ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دل میں ملاقات کی تمنا تھی اور زبان پر دعا اور تضرع۔ سمت قبلہ کو معلوم کیا۔

مہتاب کے فانوس نے پورے بیابان کو پرنور بنادیا تھا۔ اس نے اقامت کہی اور نماز کی نیت کی پھر رونے لگا۔ چہرے کی حالت متغیر ہوئی...

ایک گھنٹہ گذر گیا۔ مردصالح نے کئی بار سجدہ میں سر رکھا اور اپنے گمشدہ کو آواز دی۔ کئی مرتبہ ان کا نام لیا اور پاکیزہ ہستیوں کی انہیں قسم دی، پھر اشک آلود نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ کہیں پتہ نہیں تھا۔ کھڑا ہوا اور نماز شب کے لیے نیت کی اور دوبارہ زور زور سے رو کر اپنے دل کو ہلکا کیا۔

○

صبح ہوتے ہوتے وہ لوٹ آیا۔ سب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے کے باہر اسے گھیر لیا۔ وہ حیران و پریشان خاک آلود ان کی گود میں گر پڑا اور زار زار رونے لگے۔ بعض بزرگ حسرت سے سر پیٹنے لگے۔

پرہیزگار آدمی ننگے سر اور ننگے پیر تھا۔ اس نے نالہ و فریاد کرتے ہوئے کہا:

''انہیں نہیں پایا۔ مجھ میں اس کی اہلیت نہ تھی۔ ہر جگہ گیا، انہیں پکارا، جو کچھ میں نے پڑھا اس کے ساتھ ہی انہیں بھی صدا دی، مگر وہ نہیں آئے، نہیں آئے''۔

پھر زمین پر گر پڑا۔ اپنے سر پر دونوں ہاتھ سے مارا۔ ابوخلیل اور اس کے دوستوں نے اسے پاس کے کنویں تک پہنچایا۔ بحرین کے بزرگ بھی جھونپڑی کے اندر چلے گئے تاکہ آنے والی دوسری رات کے لئے بحرین کے دوسرے پرہیزگار آدمی کو بلا کر لائیں۔

دوسرا شخص بھی، صبح کے قریب واپس آ گیا۔ پہلی رات والے سے زیادہ حیران و پریشان۔ اس کا سن بھی زیادہ تھا۔ برابر نالہ و فریاد کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

''میں عمر کے آخری پڑاؤ پر اس امتحان میں ہار گیا۔ پروردگار! مجھ میں اس

کی صلاحیت نہ تھی"۔

بزرگوں پر خوف طاری ہوگیا تھا۔لیکن اسے تسلی اور دلداری کی۔ان کی تشویش بڑھ گئی تھی۔جھونپڑی کی فضا میں سخت ترین خاموشی کی حکمرانی تھی،جس سے خوف کی بو آرہی تھی۔آخر کار شہر کے ایک عالم نے اپنے عمامے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے اوپر کیااور اپنی پیشانی کو کھجاتے ہوئے کہا:

"پھر بھی بھروسہ رکھنا چاہیے۔ہمارے پاس آج کی رات بھی ہے۔سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ہم کو بحرین کے تیسرے پاک و صالح مرد کے پاس جانا چاہئے"۔

حاضرین میں سے ایک نے کہا:

"تیسری ہستی محمد بن عیسیٰ بحرینی ہیں۔بحرین کے گمنام مرد صالح، پاک مرد"۔

سبھی لوگوں نے زوردار آواز میں تکبیر کہی پھر صلوٰۃ پڑھی۔دو جوانوں نے اپنے جوتے پہنے تا کہ جلدی سے محمد بن عیسیٰ کے پاس جائیں اور انہیں نخلستان میں لے آئیں۔

○

ابن عیسیٰ نے جس دم بیابان میں قدم رکھا، ننگے پیر ہو گئے۔سر سے عمامہ کو اُتارا اور اپنے بالوں کو بکھیر دیا۔آنکھیں پہلے ہی بھر آئیں۔دل شکستہ ہو کر کہا:

"یہ آخری رات ہے اور بحرین کے لوگوں کی جان اور زندگی آج کی رات سے وابستہ ہے۔اے میرے پروردگار!"

اپنے گریے کو روکا اور آگے بڑھتے گئے۔وہ بہت ڈراونی اور بھیانک رات تھی۔نہ کوئی آواز آرہی تھی نہ ہوا چل رہی تھی۔ابن عیسی اتنا آگے بڑھے کہ چاروں طرف صرف بھیانک بیابان نظر آنے لگا،روتے ہوئے نماز پر کھڑے ہو گئے،بہت سجدے اور رکوع کئے اور دل کی گہرائیوں سے روئے اور گڑگڑائے،استغاثہ کیا اور بیابان کی گرم خاک پر پیشانی رگڑی۔

رات ختم ہو چکی تھی۔ابھی بھی بیابان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔صرف ہوا کی ڈراونی سی آواز تھی جو دور سے سنائی پڑ رہی تھی۔

گھنٹوں گذر گئے۔ابن عیسیٰ شکستہ دل اور زخمی قلب کے ساتھ سر جھکائے ہوئے تھے کہ ایک آواز سنی۔جلدی سے اس سمت کو مڑے جدھر سے آواز آئی تھی۔

"اے محمد بن عیسیٰ! میں تمہیں اس حال میں کیوں دیکھ رہا ہوں۔اس بیابان میں کیوں آئے ہو؟"

ابن عیسیٰ نے نظریں گھمائیں، کسی کو اپنے چاروں طرف نہیں دیکھا،کھڑے ہوئے اور انتہائی رنج سے کہا:

"آپ جو بھی ہیں مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے۔ایک بڑے مسئلے کی خاطر یہاں آیا ہوں۔اسے اپنے امام کے علاوہ کسی سے نہیں کہوں گا اور اپنی پریشانی صرف اسی سے بیان کروں گا جو اس کو حل کرنے کی طاقت رکھتا ہے"۔

پھر دوبارہ اپنے چاروں طرف گھومے اور تاریکی میں نظریں دوڑائیں۔چاہتے تھے کہ آواز دینے والے کے چہرے کو اس بیابان میں دیکھیں۔

"اے محمد بن عیسیٰ! میں صاحبِ امر ہوں،اپنی حاجت کو بیان کر"۔

ابن عیسیٰ کانپنے لگے۔دوبارہ نظریں دوڑائیں۔لگتا تھا ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے۔کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا:

"اگر آپ صاحبِ امر ہیں تو میری روداد سے آپ واقف ہیں اور مجھے بیان کرنے کی حاجت نہیں"۔

دوبارہ آواز کی لہران کی طرف آئی:

"ہاں تم سچ کہتے ہو۔تم اس انا روالی مصیبت اور حاکم کی دھمکی کے سبب یہاں پر آئے ہو"۔

ابن عیسیٰ نے آواز کی سمت کا پیچھا کیا۔اشتیاق کے ساتھ چند قدم قریب گئے اور

روتے ہوئے کہا:

''ہاں اے میرے مولا، آپ جانتے ہیں کہ کیسی بلا ہم لوگوں کے سر پر آ گئی ہے۔ آپ ہی میرے امام اور پناہ گاہ ہیں اور آپ ہی وہ واحد ہستی ہیں جو اس بلا کو برطرف کرنے کی قدرت رکھتے ہیں''۔

محبت آمیز آواز کے جھونکے نے ابن عیسیٰ کے جسم میں تازہ جان ڈال دی۔

''وزیر لعنۃ اللہ علیہ کے گھر میں انار کا ایک درخت ہے۔ جس وقت اس درخت میں پھل لگا وزیر نے مٹی سے انار کا ایک سانچہ بنایا اور اسے دو حصوں میں بانٹا اور ہر ایک پر اپنے مطلب کی کچھ عبارت جو اس وقت انار کے اوپر ہے لکھا۔ اس وقت انار چھوٹا تھا لہٰذا اسی طرح درخت پر اسے مٹی کے سانچہ میں رکھ کر باندھ دیا۔ انار اس سانچہ کے اندر بڑا ہوا اور اس لکھاوٹ کا نشان اس پر نقش ہو گیا اور موجودہ صورت میں ظاہر ہوا۔ صبح کو جس وقت حاکم کے پاس جانا تو اس سے کہنا کہ میں جواب اپنے ساتھ لایا ہوں، مگر اس کا جواب وزیر کے گھر دوں گا۔ جب وزیر کے گھر میں داخل ہو گے تو داہنے ہاتھ کی طرف ایک کمرہ نظر آئے گا۔ حاکم سے کہنا کہ میں جواب اس کمرہ کے علاوہ اور کہیں نہیں دوں گا۔ اس موقع پر وزیر تمہیں اس کمرہ میں داخل ہونے سے منع کرنا چاہے گا، مگر تم اصرار کرنا کہ کمرہ کے اندر جائیں گے۔ خیال رکھنا کہ وزیر جلدی سے اکیلے کمرہ میں داخل نہ ہو جائے یعنی پہلے تم داخل ہونا۔ وہاں پر ایک طاقچہ نظر آئے گا جس کے اوپر سفید رنگ کی ایک تھیلی رکھی ہے۔ تھیلی کو کھولنا۔ اس تھیلی میں مٹی کا سانچہ ہے کہ جس سے اس ملعون نے اپنا یہ تماشہ انجام دیا ہے۔ اس انار کو حاکم کے سامنے اس سانچہ میں رکھنا تا کہ وزیر کا مکر و فریب ظاہر ہو جائے''۔

ابن عیسیٰ سوکھی لکڑی کی مانند بے حس و حرکت مبہوت کھڑے تھے۔ آواز کی حلاوت اور جاذبیت اس آدھی رات میں ان کے دردمند دل کے لیے مرہم کا کام کر گئی۔

''حاکم سے کہنا کہ ہمارا دوسرا معجزہ یہ ہے کہ جس وقت انار کو آپ توڑیں گے سوائے دھوئیں اور دھول کے اور کوئی چیز اس میں دکھائی نہیں دے گی۔ اور یہ بھی کہنا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس بات کی سچائی معلوم ہو تو وزیر کو حکم دیجیے کہ لوگوں کے سامنے انار کو توڑے۔ جس وقت وہ یہ کام انجام دے گا وہ دھول اور دھواں وزیر کے چہرہ اور داڑھی پر جم جائے گی''۔

وہ دلنشیں مہربان آواز دوبارہ نہیں آئی۔ ابن عیسیٰ سر سے پیر تک پسینہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اپنے پیروں پر زور دیا اور چند قدم آگے بڑھے۔ سوچ رہے تھے کہ امام کی گفتگو ابھی جاری رہے گی۔ تھوڑی دیر رکے۔ لیکن اس بیابان میں دوبارہ کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ جلدی سے چند قدم آواز کی سمت دوڑے اور چلّائے:

''میرے مولا!''

نالہ و فغاں کرتے ہوئے چاروں طرف ڈھونڈھا۔ صاحبِ صدا کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ مضطرب ہوئے اور اپنے چہرے کو بیابان کی گرم ریت پر رکھا اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ اس قدر گریہ کیا کہ اُٹھنے کی طاقت نہ رہی۔

○

بہت سارے سوار حاکم اور وزیر کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے محمد ابن عیسیٰ اور دوسرے بزرگانِ شیعہ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار وزیر کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ وزیر بزرگانِ شیعہ اور حاکم کے اس عمل سے متعجب تھا، اور ان کے ارادوں کے بارے میں اسے کچھ خبر نہ تھی۔

سوار وزیر کے شاندار مکان پر پہنچے جو بحرین کے ایک آباد محلّہ میں تھا۔ گھوڑے اہلکاروں کے حوالے کئے گئے۔ حاکم، وزیر اور ان کے ساتھ جو لوگ تھے وزیر کے گھر

میں داخل ہوئے۔ وزیر حیران ومبہوت ہوکر ابن عیسیٰ کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا جو حاکم کے شانہ بشانہ گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے حاکم کا محافظ دستہ اور کچھ سردار گھر کے صحن میں آئے۔ شیعوں کی قدآور ہستیاں بھی صحن میں موجود تھیں۔ حاکم صحن کے بیچوں بیچ کھڑا ہوگیا اور ابن عیسیٰ کو گھورنے لگا مگر کچھ کہا نہیں۔

ابن عیسیٰ نے بڑے ہی اطمینان اور سکون کے ساتھ گھر کے اندر نظریں دوڑائیں۔ انار کے بڑے درخت پر نظر پڑتے ہی مسکرائے۔ وزیر جو پریشان ہو چکا تھا اپنی انگلی سے اپنی پوری پیشانی سے پسینہ پوچھا اور ابن عیسیٰ پر نظریں گاڑ دیں۔

ابن عیسیٰ اس کمرہ کی طرف گئے جو گھر کے داہنی طرف تھا۔ کمرے کے باہر کھڑے خدمت گار نے تعظیم کی۔ کمرہ کا دروازہ بند تھا۔ ابن عیسیٰ نے کہا:

''دروازہ کھولو''۔

خدمت گار نے اپنی نظریں وزیر کی طرف گھمائیں تا کہ وہ کچھ کہے۔ وزیر گھبرایا۔ فوراً تیز قدم بڑھایا اور چرب زبانی سے کہنے لگا:

''اس طرف سے تشریف لائیے۔ مہمان خانہ کا راستہ ادھر سے ہے، وہ جگہ امیر کے شایانِ شان نہیں ہے''۔

ابن عیسیٰ نے فوراً کہا:

''ہمیں اس کمرے میں جانا ہے''۔

وزیر نے کہا:

''آخر کیوں؟''

حاکم نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا:

''جہاں ابن عیسیٰ کہتے ہیں ہم وہیں جائیں گے''۔

سب لوگ چل پڑے۔ وزیر بڑی بے چینی سے دروازہ کی طرف دوڑا اور ان کے سامنے آکر کہا:

''آخر میرے سرور اس جگہ...''

پھر رسوائی کے خوف سے کمر تک خم ہوا اور کہنے لگا:

''البتہ اس گھر میں جس جگہ قدم رکھیں گے آپ کا قدم مبارک ہے''۔

پھر اس نے بڑی عجلت کی تا کہ دوسروں سے پہلے کمرہ میں داخل ہو جائے لیکن ابن عیسیٰ نے سبقت کی اور کمرہ میں داخل ہو گئے۔ حاکم بھی ان کے پیچھے کمرہ میں داخل ہوا۔ وزیر بھی حاکم کے پیچھے پیچھے کمرہ میں آیا اور اپنی پریشان نظریں طاقچہ پر ڈالیں۔

اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ ابن عیسیٰ اس راز والی تھیلی کے لئے آئے ہیں۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کی زبان سوکھ گئی تھی اور کان بھاری ہو گئے۔

ابن عیسیٰ کو فوراً ہی تھیلی طاقچہ پر مل گئی۔ قریب گئے اور وزیر سے پہلے سفید تھیلی پر جھپٹا مارا۔ حاکم اور دوسرے لوگ اس کے پاس کھڑے ہو گئے۔ وزیر نے خود کو پرسکون اور بے پروا ظاہر کیا۔ مگر دل ہی دل میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ حاکم نے آنکھیں پھاڑیں اور ابن عیسیٰ کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔

کمرہ کے اندر کا گہرا سناٹا وزیر کی آواز سے ٹوٹ گیا۔

''وہ... تھیلی''۔

مگر اس کی خشک زبان اس کے تالو سے چپک گئی۔ ابن عیسیٰ نے تھیلی کے اردگرد کی گرہ کھولی۔ فوراً ہی مٹی کا ایک سانچہ تھیلی سے باہر نکلا۔ سب کی گردنیں اس طرف اٹھیں۔

ابن عیسیٰ نے کہا:

''اس انار کو مجھے دیجیے''۔

ایک سردار تھیلی ہاتھ میں لے کر قریب آیا۔ انار کو باہر نکالا اور حاکم کے ہاتھ میں دیا۔ حاکم نے انار کو ابن عیسیٰ کے حوالہ کیا۔ وزیر کے ہاتھ پیر پہلے سے زیادہ کانپنے لگے اور وہ پریشان ہو گیا۔ ابن عیسیٰ نے اطمینان سے اس سانچہ کو حاکم اور موجود لوگوں کی آنکھ کے سامنے گھمایا۔ پھر انار کو اس کے اندر رکھا۔ انار اچھی طرح اس میں فٹ بیٹھ

گیا۔حاکم نے آنکھیں کول کیں اور ابروؤں کو سمیٹا۔لوگ حیران رہ گئے۔

وزیر نے اپنے چاروں طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ بھاگ جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ حاکم نے اس سانچہ اور انار کو ابن عیسیٰ سے لیا اور اسے خوب اُلٹا پلٹا اور غصہ سے اپنے دانتوں کو پیسنے لگا۔ وزیر نے دوبارہ اپنے پرسکون ہونے کا مظاہرہ کیا اور کہا:

''قربان جاؤں۔ یہ چیز مٹی کا ایک ٹکڑا ہے کہ ہنرمندی سے کندہ کاری...''

مگر فوراً ہی حاکم کی تیز و تند نگاہوں کے سبب اپنا منھ بند کرلیا۔ وزیر جو غصہ میں تھا اپنے دل میں سوچنے لگا:

''یعنی کس نے اسے اس کی خبر دی ہے؟''

ابن عیسیٰ نے کہا:

''اے امیر! ہمارا دوسرا معجزہ یہ ہے کہ جس وقت آپ اس انار کو توڑیں گے تو سوائے راکھ اور دھوئیں کے اس میں کچھ نہ ہوگا۔ اگر آپ میری بات کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو وزیر کو حکم دیجیے کہ تمام لوگوں کی موجودگی میں اسے توڑے''۔

حاکم نے اپنی غضب آلود نگاہوں سے وزیر کو حکم دیا۔ وزیر نے کانپتے ہوئے انار کو لیا اور ایک لمحہ کے توقف کے بعد اسے توڑا۔ ایک کالا دھواں اُٹھا اور وزیر کے چہرہ اور داڑھی پر پھیل گیا۔ وزیر کھانسنے لگا اور اپنے چہرہ کو اپنے عمامہ کے ایک گوشے سے چھپالیا۔

حاکم نے حیرت و استعجاب سے اپنا منھ کھولا اور بلند آواز میں کہا:

''لا الٰہ الاّ اللہ''۔

وزیر پست غلاموں کی طرح حاکم کے پیروں پر گر پڑا۔ ابن عیسیٰ اور بزرگانِ شیعہ نے تکبیر کے لیے اپنے منھ کھولے اور مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوگئے۔

حاکم نے ابن عیسیٰ کو اپنے گلے سے لگالیا اور پوچھا کہ:

''اس واقعہ کی تمہیں کس نے خبر دی۔ تم تو اس کے گھر میں آ بھی نہیں سکتے''۔

ابن عیسیٰ نے خوش ہوکر کہا:

''ہمارے امامِ زمانہؑ اور زمین پر خدا کی حجت نے''۔

حاکم نے پوچھا:

''وہ کون ہیں؟''

ابن عیسیٰ نے پیغمبرؐ کے بعد ایک ایک امام کا نام حاکم کے لیے دہرایا اور پھر امام زمانہ کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔

وزیر نے ایک چیخ ماری۔ چوکیدار نے اس کے شانوں کو پکڑا اور اسے ایک طرف کھینچ کر لے گیا۔

حاکم نے ابن عیسیٰ سے کہا:

''آپ اپنا ہاتھ بڑھایئے تاکہ تمہارے ہاتھ پر اس برحق مذہب کی بیعت کروں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے خدائے یگانہ کے اور کوئی خدا نہیں ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ بندہ اور اس کے رسول ہیں اور امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالب اور ان کے گیارہ فرزند پیغمبر اسلام کے بلافصل خلیفہ ہیں''۔

ابن عیسیٰ نے حاکم کے شانوں کو پکڑا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ وزیر کی زور زور سے چیخ و پکار نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ امیر نے غصہ سے اس کی طرف نگاہ کی اور ایک سردار کی طرف مخاطب ہوکر کہا:

''اس کی سزا موت ہے اور خدا اور پیغمبرؐ کے اہلِ بیت کے چالباز دشمن کے لیے یہ کمترین سزا ہے''۔

○○

اس فتوے کی خاطر

شیخ[1] فکر میں ڈوبے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ اپنی چھڑی کے دستہ کو اپنے ایک ہاتھ میں دبایا۔ دوسرا ہاتھ اپنی کمر پر رکھا اور اندرونی اضطراب کے ساتھ جو ان کی پرسکون نگاہ کے پیچھے دوڑ رہا تھا چل پڑے۔ شیخ کے گھر کے باہری حصے کا صحن کافی کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ چند درخت اور پھولوں کے کچھ بڑے پودے جو بغداد کی گرم آب و ہوا کو برداشت کرسکتے تھے ان کے بڑے باغیچہ کو زینت بخش رہے تھے۔ ان میں زیادہ کھجور کے درخت نظر آتے تھے۔ پرانے پھل دینے والے درخت جو چھتری کی طرح پھولوں اور چھوٹے موٹے پیڑوں پر تنے ہوئے تھے۔

شیخ نے یوکلپٹس اور انار کے درختوں کے شانہ بشانہ باغیچہ کا چکر لگایا۔ اسی تازہ اضطراب اور گہری فکر کے ساتھ۔ ہمیشہ کی طرح گل زنبق (چنبیلی کا پھول) کی طرف نہیں گئے۔ انہیں دیکھا تک نہیں نہ ہی سونگھا۔ ان کے دماغ میں ایک عجیب فکر سما گئی تھی

۱۔ شیخ: ابوعبداللہ محمد بن محمد بن نعمان بغدادی ۳۳۶ قمری میں بغداد کے قریب پیدا ہوئے اور ۴۱۳ قمری میں بغداد میں فوت ہوئے۔ وہ شیعوں کے نامور فقیہ اور بزرگ و دانشمند علما میں سے تھے۔ وہ فقہ، اصول، کلام، جدل وغیرہ جیسے علوم میں نامور اور برجستہ تھے۔ شیخ مفید قرن چہارم سے قرن پنجم کے اوائل تک شیعوں کی زعامت کے عہدہ پر مامور تھے اور تقریباً بیس کتابیں لکھیں۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ جس وقت بغداد میں ان کا انتقال ہوا تو اسی ہزار لوگوں نے ان کے جنازہ میں شریک تھے اور انہیں حرم کاظمین علیہم السلام میں دفن کیا گیا۔

جس نے انہیں حیران کردیا تھا۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ اس ادھیڑ عمر کے دیہاتی آدمی سے واقعے کے بارے میں سوال کرے۔ انہیں احساس ہورہا تھا کہ رونما ہونے والے اس اہم واقعے کے پیچھے دست غیبی چھپا ہوا ہے۔ ایسا محبت کرنے والا ہاتھ کہ کبھی کبھی اس کی بے پناہ محبت کو شیخ محسوس کرتے تھے۔

وہ دیہاتی شخص کسی دور کے گاوں سے شیخ کا مہمان ہوا تھا۔ ہر سال کی طرح (اس سال بھی) وہ آیا تھا تا کہ اپنے وجوہات شرعیہ کا حساب کرے۔ مگر اپنے ساتھ ایک عجیب و غریب داستان شیخ کے لیے لایا تھا۔ شیخ کا شمار شیعوں کی بزرگ ہستیوں میں ہوتا تھا۔ اس واقعہ نے شیخ کو بے چین کردیا، ان کے چہرہ پر فکر و پریشانی کی لکیریں پڑگئیں اور اطمینان کی خنکی ان کے جلوۂ خیال سے جاتی رہی۔

شیخ کے بوڑھے خادم کربلائی کی آنکھیں ان کی عجیب و غریب کیفیت دیکھ کر پھٹی رہ گئیں، وہ باغیچہ کے ایک گوشہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کا ذہن شیخ کے قدموں کی طرف گیا۔ رفتار مسلسل اور تیز تھی اور ان کی چھڑی کی کھٹ کھٹ صحن کے پختہ فرش پر ایک لطیف آہنگ پیدا کررہی تھی۔

کربلائی نے اپنے دل میں سوچا کہ اس دیہاتی مرد کے بیان کردہ اس چھوٹے سے واقعے کے پیچھے کوئی بہت بڑا ماجرا پوشیدہ ہے۔ بلا سبب شیخ کی آنکھیں اچانک سرخ نہیں ہوگئیں اور ان کے ہاتھ ہلنے نہیں لگے اور ان کا نچلا ہونٹ کانپنے نہیں لگا۔

یعنی اس دیہاتی مرد کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ مدتوں پہلے شیخ نے ایسا کیا کیا تھا۔ نیز اس حاملہ عورت کے واقعہ اور شیخ کے فتوے میں کیا ربط ہے۔ اگر چہ کربلائی ضعیف العمر تھے لیکن ہوش و حواس کے تیز تھے۔ دین کے احکام کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود شیخ کے گھر میں رہ کر مسائل سے اچھی طرح واقف ہوگئے تھے۔

خود وہ دیہاتی مرد بھی اچانک اس بھولے ہوئے پرانے قصہ کو اپنے مرجع سے

بیان کرنے کی وجہ سے پریشان تھا۔اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں تھیں۔

شیخ کو یا تو اس کیفیت سے باہر نکل آنا چاہئے تھا یا دل میں کوئی فیصلہ کرتے یا کوئی گفتگو کرتے یا کوئی کام انجام دیتے۔کربلائی سے کہا کہ کتاب خانہ سے عبا اور عمامہ لائے، پھر اسے پہنا اور چل پڑے۔کدھر۔شاید خچر پر سوار ہوکر اس آدمی کے گاؤں کی طرف۔پھر تینوں دُنیا سے اُٹھ جانے والی اس جوان عورت کے گھر جاتے اور پھر اس کے بعد---واقعہ کی بقیہ تفصیلات۔

شاید شیخ اس دُنیا میں نہیں تھے۔گھر کے کنویں کے پاس کھڑے تھے۔ کنواں آسمان کی طرف منھ کیے ہوئے تھا اور اپنی ٹھنڈی سانس کو باہر نکال رہا تھا۔شیخ کا ہاتھ کنویں کی گراری پر تھا پھر اپنے سر کو اس کے منھ کے قریب لے گئے۔شاید ہمیشہ کی طرح کنویں میں کچھ کہہ رہے ہوں۔کربلائی کو بھی تعجب ہوا تھا اور اس دیہاتی مرد کو بھی۔شیخ نے جلد ہی اپنا چہرہ کنویں کی طرف سے ہٹالیا اور اس دیہاتی مرد کی طرف مڑے۔ان کی لمبی اور سفید داڑھی جس کا ایک ایک بال گنا جاسکتا تھا آفتاب کے روشن سایہ میں اچھی طرح چمک رہا تھا۔گال باہر کی طرف نکل آیا تھا اور ان کی لمبی اور کھلی ہوئی آنکھوں کو ایک خاص خوبصورتی دے رہا تھا۔ان کی پیشانی پہلے سے بھی زیادہ چمک رہی تھی۔لمبی اور روشن پرانی لکیروں کے ساتھ۔دیہاتی مرد نے ایک لمحے کے لیے شیخ میں ان تمام کیفیات و حالات کا مشاہدہ کیا اور محظوظ ہوا۔

شیخ نے اپنے زیر لب جملہ کو زور سے دھرایا۔وہی جملہ جسے دیہاتی مرد کی گفتگو کے اختتام کے فوراً بعد فقط ایک بار اس سے مخاطب ہوکر کہا تھا:

''مگر میں نے تو کسی کو نہیں بھیجا تھا!''

یہ جملہ کئی بار دہرایا گیا۔لگاتار، ایک ہی طرح سے، تپش اور غم اور حسرت کی ایک پرت کے ساتھ۔

شیخ ایک بزرگ عالم دین تھے۔سربرآوردہ لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور لوگ

انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ان کا رہن سہن، گھر اور دفتر انتہائی سادہ تھا۔ان کی سواری غریبوں جیسی تھی۔مگر وہ لوگ جو ان کے قدموں پر اپنی جان نچھاور کرتے تھے اور ان کے کلام کا گھونٹ گھونٹ پیتے تھے وہ بے شمار تھے۔نہ صرف بغداد کے لوگ بلکہ کربلا، خراسان، ری اور قم کے رہنے والے بھی ان کے مقلّد اور بہی خواہ تھے۔لیکن اب کیا ہوا۔اس وقت ایک واقعہ اور ایک سادہ لوح دیہاتی آدمی کی بات جلیل القدر شیخ کے پہاڑ جیسے دل کو پگھلا رہی۔

آخری جملہ ادا کرنے کے ساتھ ہی شیخ کا درد پہلے سے زیادہ نمایاں ہوگیا۔اپنے چہرہ کو قبلہ کی طرف گھمایا۔گریہ وزاری کیا، دعا پڑھی، پھر ہاتھ اپنے سینہ پر رکھا اور ایک آہ کھینچی۔

کربلائی فوراً ہی ان کی طرف گئے اور گھبراتے ہوئے کہا:

''کیا ہوگیا جناب۔اپنا اپنے آپ پر قابو رکھئے۔کچھ بھی نہیں ہے انشاءاللہ''۔

دیہاتی مرد نے سر جھکالیا اور دونوں ہاتھوں کی موٹی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرلیں اور زیادہ شرمندگی محسوس کرنے لگا۔

شیخ اپنی چھڑی پکڑتے ہوئے صحن کی پتھر کی سیڑھیوں کی طرف چل پڑے۔پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان کے ذہن میں کیا گزر رہی ہے۔دیہاتی مرد متردّد اور سوالیہ انداز میں کھڑا ہوگیا۔شیخ واپس مڑے اور ایک اُچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔پھر ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بات ان کے ذہن میں آگئی ہے۔پوچھا:

''پورا واقعہ تم نے بیان نہیں کیا''۔

پھر اس کے قریب آئے۔باغیچہ کے کنارے جہاں چٹائی بچھی ہوئی تھی بیٹھ گئے۔دیہاتی مرد دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور اس واقعہ کی تفصیل بتانے لگا۔

جناب، آپ نے جس وقت فتویٰ دیا میں اور میرے ساتھی حیرت میں پڑ گئے۔ آپ کے فتوے کی وجہ سے نہیں کیونکہ آپ ہمارے بزرگ ہیں بلکہ اس زندہ بچہ کی وجہ

سے جو مردہ عورت کے پیٹ میں تھا۔ البتہ مجھے بھی پہلے یقین نہیں تھا کہ وہ بچہ زندہ ہے مگر عورتوں کے اصرار نے مجھے آپ کے گھر کی طرف روانہ کیا۔ عورتوں نے بتایا کہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ ہم لوگوں کے لیے وہ دن بہت سخت تھا۔ سبھی لوگ اس مردہ جسم کے قریب ایک عجیب حال میں کھڑے تھے۔ اس غریب اور چھوٹے سے گاؤں، تھوڑے سے عزادار، وہ جوان حاملہ ماں، جس کے جسم میں جان نہیں تھی، اس کی آنکھیں خمار آلود لگ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کوئی اس کے شکم میں فریاد کر رہا ہے اور اس تاریکی میں اپنے معصوم ہاتھوں کو ہم لوگوں کی طرف پھیلائے ہوئے ہے۔ عورتیں رو پیٹ رہی تھیں اور اپنے چہروں پر دو ہتھڑ مار رہی تھیں۔ تمام مرد بھی دیواروں کے ساتھ ساتھ جھکے ہوئے نڈھال کھڑے تھے اور بچے سہمے ہوئے کبوتر کی طرح حیران تھے۔

میں اور کچھ سن رسیدہ لوگ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے آپ کے گھر آئے۔ ہمارے گاؤں کے پیش نماز نے ہمیں بھیجا تھا۔ ان کو اس بات میں شک تھا کہ کیا بچہ کو پیٹ سے باہر نکال لیں یا ماں کے ساتھ دفن کر دیں۔ بالآخر ہمیں آپ کی طرف بھیجا اور کہا کہ آقا ہمارے مرجع ہیں اور ان کے فتوے پر عمل کرنا واجب ہے۔

اور ہم لوگ فوراً ہی یہاں آئے۔ اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ آپ گھر پر ہوں اور خدا کا شکر کہ آپ موجود تھے۔ ہم نے جلدی جلدی پورا واقعہ آپ سے بیان کیا اور آپ نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت کو اس بچہ کے ساتھ دفن کر دیں۔

پہلے تو یہ ہم لوگوں کو عجیب سا لگا، مگر نہیں، اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ بچہ دُنیا میں نہیں آیا تھا تاکہ کوئی اس پر ترس کھائے۔ صرف کچھ عورتیں کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے بچہ کو مردہ ماں کے بطن میں ہلتے جلتے دیکھا ہے۔ بس یہی اور یہ بات حجت نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ جوان عورت کے جسم میں جان نہیں تھی اور اس کا بیٹا بھی یقیناً مرنے کی حالت میں تھا یا شاید مر چکا تھا اور وہ چند بار ہاتھ پیر کا مارنا

جانکنی کی بنا پر ہوا ہو۔ کیا کر سکتے تھے، کیا بچے کو باہر نکالا جا سکتا تھا۔ جلدی سے جلدی اس حاملہ عورت کو اپنے بچہ کے ساتھ دفن کرنا چاہئے۔ اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا اور ہم کو شرع مقدس کی اطاعت کرنی چاہئے تھی اور آپ کے فتویٰ کو سر آنکھوں پر رکھنا چاہئے تھا۔ ہم نے یہی کیا۔ ایک لمحے کے لئے ٹھہرنا بھی ہمارے لئے حرام تھا۔ پس ہم لوگ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ہوا کے جھونکوں کی طرح سنگلاخ راستوں کو طے کرنے لگے تاکہ گاؤں پہنچیں اور لوگوں کو صحیح راستہ بتائیں۔ میں اپنے ساتھیوں سے آگے گھوڑا دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ میرے دل کو آرام نہیں تھا۔ میرا ذہن اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو میری رشتہ دار تھی۔ بے چاری جوانی میں مر گئی اور ایک سخت داغ اپنے شوہر اور گاؤں کے تمام لوگوں کے دل پر چھوڑ گئی تھی۔ وہ بھی اس طرح اور اس حالت میں کہ بچہ ماں کے پیٹ میں زندہ تھا، بڑی ہی دردناک تھی یہ کیفیت۔ اس بات کو سننے سے پتھر کا دل بھی پگھل جاتا تھا، انسان کی بات چھوڑیئے۔

میں انہیں پریشان خیالوں میں گم تھا کہ میرے کسی ساتھی کی آواز نے مجھے پیچھے کی طرف متوجہ کیا۔ گھوڑے کی لگام کو دونوں ہاتھوں سے کس کے پکڑا اور مڑ کر غور سے دیکھا۔ عجیب بات تھی۔ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا میری سمت آ رہا تھا۔ میرے ساتھیوں کو بھی تعجب ہوا اور وہ میرے ردِّعمل کے منتظر تھے۔ سوار ہم لوگوں کے بہت قریب آ گیا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ہوا کی رفتار سے آ رہا تھا۔ اس کا گھوڑا صحت مند اور ہوا سے باتیں کرنے والا تھا، اور وہ خود پورے کنٹرول کے ساتھ اس پر تشریف فرما تھا۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کی رفتار دھیمی کر دی۔ بہت جلد مرد سوار آ پہنچا اور ہمیں اشارہ کیا کہ ٹھہر جائیں۔ ہم سب ٹھہر گئے۔ وہ بھی ٹھہر گیا۔ اکھڑی ہوئی سانسوں سے ہم لوگوں نے اسے دیکھا۔ محبت آمیز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا اور فوراً کہا کہ شیخ مفید نے فرمایا ہے کہ اس عورت کا پیٹ چاک کریں اور بچہ کو باہر نکال لیں پھر اسے دفن کر دیں۔

ہم نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا مگر کچھ پوچھنے کی گنجائش نہ تھی تاکہ ان

سے فتوے کی تبدیلی کی وجہ دریافت کریں۔ ہم لوگ خدا حافظ کہے بغیر اس سے الگ ہوگئے اور اپنے گھوڑوں کو گاؤں کی سمت موڑ دیا۔

جب ہم لوگ گاؤں پہنچے تو گھر کے چاروں طرف لوگ ابھی بھی موجود تھے۔ میں فوراً ہی گھوڑے سے نیچے اُترا اور گھر کی طرف دوڑا۔ پیش نماز دروازے کے پاس منتظر کھڑے تھے اور برابر تسبیح پڑھے جارہے تھے۔ جب مجھے دیکھا تو اپنے ابروؤں کو سمیٹا اور گھبرا کر پوچھا:

''کیا ہوا؟''

میں نے فوراً ہی کہا کہ آقا کا فتویٰ یہ ہے کہ میّت کا پیٹ چاک کریں اور زندہ بچہ کو باہر نکال لیں اور تب میّت کو غسل و کفن اور دفن کے لیے لے جائیں۔

وہ کمرہ کی طرف دوڑے۔ عورتیں اور زیادہ نالہ وشیون کرنے لگیں اور آخرکار گاؤں میں پیٹ کو چاک کرنے اور دوسرے کام انجام دینے کے لئے ایک آدمی مل گیا۔

آنسوؤں کے موٹے موٹے چمکدار قطروں نے شیخ کی داڑھی کے ایک ایک بال کو بھگو دیا تھا۔ شیخ کو قرار و آرام نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتے ہیں، کوئی اہم بات، ان کی پھیلی ہوئی اور باتوں سے لبریز آنکھوں سے ظاہر ہورہا تھا۔ فوراً ہی محبت بھرے لہجے میں کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے پر سوار شخص ہمارے مولا حضرت صاحبِ زمانؑ تھے کیونکہ میں نے تمہارے پیچھے کسی کو نہیں بھیجا تھا۔

کربلائی اور دیہاتی آدمی دونوں کا دل بیٹھ گیا اور سر سے پیر تک کانپنے لگے۔ دونوں کے رنگ متغیر ہوگئے اور ان کی آنکھوں کے کٹورے تازہ آنسوؤں سے چھلکنے لگے۔ مولا کا نام سنتے ہی ان کا دل سینہ میں دھڑکنے لگا۔ دیہاتی مرد نے چاہا کہ اپنے سر پر دو ہتھڑ مارے اور فریاد کرے اتنا اچھا موقع اور مولا کی زیارت ہاتھ سے جاتی رہی۔ اس وقت بے لگام گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اپنے کو زحمت نہیں دی کہ چند لمحے غور سے انہیں دیکھیں۔ شیخ سے یہ کیا سنا! دل ہی دل میں خود پر کئی بار لعنت بھیجی۔ افسوس کہ

وہ سوار اپنا بارہواں معصوم پیشوا تھا۔ لگتا تھا وہ دیوانہ ہوجائے گا، اب یہ واقعہ بہت ہی پیچیدہ اور عجیب ہوگیا تھا۔ اگر وہ جاتا اور سفید پوش سوار کی داستان کو اپنے ہمراہی سواروں سے بیان کرتا تو حق تھا کہ وہ بھی رنج و غم سے بیقرار ہوا ٹھیں۔

دیہاتی مرد کے ہونٹ کانپے، کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر لکنت نے طاقتِ گویائی کو اس سے سلب کرلیا تھا۔ رولینا چاہیے تاکہ کچھ آرام ملے۔ یہی وقت ہے کہ وہ اپنے عبا کی جیب سے رومال نکالے اور اپنی گرد و غبار سے اٹی میلی کچیلی صورت کو اس میں چھپالے اور زور زور سے نالہ وفریاد کرے۔ گریہ ایک اچھی دوا ہے۔ دل بھی ہلکا ہوتا اور زبان کی لکنت بھی ختم ہوجاتی اور اس کے بھاری شانے بھی غم کی سنگینی سے ہلکے ہوجاتے۔ پس رویا اور اس کے ساتھ ہی کربلائی نے بھی نالہ کیا، پھر یہ شیخ تھے جو آہستہ آہستہ رو رہے تھے۔

سیڑھیوں سے اوپر گئے پھر سرگوشی کی اور زمزمہ کرتے ہوئے کہا:

''ہمارے وہ بزرگ اور عزیز آقا حضرت صاحبِ امر تھے۔ ہمارے حال پر افسوس کہ ہم نے ان کے وجود کا ادراک نہیں کیا''۔

اوپر چبوترے پر پہونچ کر ایک آہ کھینچی اور آسمان کی طرف رخ کرکے کہا:

ہم نے شرعی احکام میں غلطی کی، اس سے تو بہتر یہی ہے کہ دوبارہ فتویٰ نہ دیں۔

کچھ گھنٹوں بعد شیخ کے گھر کا دروازہ بند ہوگیا۔ انہوں نے اس غلطی کی بنا پر فتویٰ دینا چھوڑ دیا۔ مُہر کو صندوقچہ میں رکھ دیا اور درس و بحث میں لگ گئے۔

زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ شیخ کو ایک توقیع[1] ملی، وہ توقیع خوبصورت خط میں تحریر تھی اور مہر شدہ لفافے میں ان کے حوالے کی گئی۔ وہ خط حضرت صاحب الزمانؑ کی طرف سے تھا۔ امامؑ نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا تھا:

۱۔ توقیع: وہ تحریر جو خط کی صورت میں مہر اور دستخط کے ساتھ ائمہ معصومینؑ یا بزرگانِ شیعہ کی طرف سے کسی اہم مسئلہ میں لکھی جاتی ہے۔

’’تم پر لازم ہے کہ فتویٰ دو اور ہم پر ہے کہ تمہیں غلطی نہ کرنے دیں‘‘۔

شیخ مفید نے خط پڑھنے کے بعد خاموشی اور عزلت سے اپنا سر باہر نکالا اور اپنے گھر کے دروازہ کو لوگوں کے لئے کھول دیا اور ان کی مشکلوں کے حل کرنے والے اور غمخوار بن گئے۔

○○

محبت کے غنچے

جناب آیۃ اللہ العظمیٰ حاج سیّد حسین طباطبائی بروجردی[۱] کا ادھیڑ عمر خادم دوبارہ دروازہ کی طرف گیا اور اس کی ہینڈل کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے چہرہ سے ٹکرائی۔ گلی کے آخری سرے تک نظر دوڑائی۔ تانگے کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ گھبراتے ہوئے دروازہ بند کیا اور جناب کے کمرہ کی طرف چل پڑا۔ قدیمی دالان سے گزرنے کے بعد اپنے آپ سے کہا:

’’آخر صبح صبح اتنی جلدی جناب کہاں جانے والے ہیں، کیوں کسی کو کچھ نہیں بتا رہے ہیں؟‘‘

خادم کمرے میں گیا۔ جناب خیالوں میں گم ایک چھوٹے سے گاؤ تکیہ سے جس پر ہرے رنگ کے مخمل کا غلاف چڑھا ہوا تھا، ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پچھلے دن درس کے بعد جب گھر آئے تب سے یہی کیفیت تھی اور کبھی کبھی آہ کھینچتے تھے۔

خادم شروع سے ہی جناب کے لئے گھبرایا ہوا تھا اور ایک بے کیفی کے احساس سے دوچار تھا۔ بہت کوشش کی کہ ہمت کرکے ان کی پریشانی کا سبب معلوم کرے، مگر

۱۔ آقا: آیۃ اللہ العظمیٰ حاج سیّد حسین طباطبائی بروجردی اپنے عہد کے دانشمند بزرگانِ دین میں سے تھے۔ ۱۲۹۲ ہجری میں بروجرد میں پیدا ہوئے۔ حوزہ کے درس کو بہت ہی فہم و ذکاوت کے ساتھ قم، اصفہان اور نجف میں حاصل کیا۔ بزرگ علماء کی خواہش پر ۱۳۲۳ شمسی میں قم چلے گئے اور تھوڑی ہی مدت میں دنیا کے شیعوں کے مرجع ہوگئے۔ ۱۳۴۰ شمسی میں انتقال فرمایا اور قم کی مسجد اعظم میں سپرد خاک ہوئے۔

ایسا نہ کرسکا۔ایسا نہیں تھا کہ وہ جناب سے ڈرتا تھا بلکہ وہ تو بہت ہی محبت کرنے والے اور گھل مل جانے والے تھے۔لیکن ان کی نگاہ کی ہیبت اس امر سے مانع تھی کہ خادم ہر سوال ان سے پوچھے۔ جناب نے ان چند ساعتوں میں اپنے ہونٹ تک نہ کھولے۔کئی مرتبہ اپنے خادم اور دفتر کے لوگوں سے شیخ علی کے بارے میں دریافت کیا اور کہا اگر وہ دکھائی دے جائے تو اس سے کہنا کہ جلدی میرے پاس آئے، مجھے اس سے کام ہے۔

پھر سرِشام ہی خادم کو تانگے والے کے پاس بھیجا کہ کل صبح سویرے جناب کے دروازہ پر آجائے۔ جناب جب کہیں جانا چاہتے تھے تو تانگہ منگواتے تھے۔جبکہ شہر میں اکا دکا گاڑیاں بھی تھیں مگر وہ سادہ ترین امکانات سے استفادہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

جناب آیۃ اللہ العظمیٰ کمرہ کے گوشہ میں اپنی کتابت کی چھوٹی سی میز کے پیچھے تیار بیٹھے ہوئے تھے۔جسم پر سفید قبا ڈال رکھی تھی اور سر پر ایک نفیس سیاہ عمامہ تھا۔ابھی تانگے والا نہیں آیا تھا۔آقا نے اپنا سفید رومال منہ پر رکھ کر چند بار دھیرے دھیرے کھانسا۔ اپنی سفید اور کشادہ ابرو کے نیچے سے اپنی پُراثر نگاہیں حیرت زدہ خادم کی آنکھوں میں ڈالیں اور پوچھا:

''کیا ہوا،نہیں آیا؟''

خادم نے اپنے ہاتھ جوڑے اور کمرے کے اندر الارم گھڑی پر نظر ڈالی اور جواب دیا:

''اب وقت ہو چکا ہے، آنے ہی والا ہے''۔

جناب ان کے سامنے رکھے ہوئے خطوط کو دیکھنے لگے۔ایک خط کو اپنے کانپتے ہاتھوں سے اُٹھایا اور اسے کھولا۔خادم نے سنجیدہ انداز میں کہا:

''جناب اگر آپ پسند کریں تو میں تانگے والے کے گھر جاؤں''۔

جناب نے دوسرا خط اُٹھایا اور اس کا سرا آرام سے کھولا اور اپنی اسی پرمعنی نگاہ سے کہا:

''نہیں، انتظار کرتے ہیں''۔

جناب کا ایک سن رسیدہ شاگرد جو کمرہ میں تھا اور کسی کتاب پر حاشیہ نویسی کررہا تھا

اپنے چشمہ کو پیچھے سرکایا اور اس کے پیچھے سے خادم کو کنکھیوں سے دیکھا۔خادم دروازہ کے قریب بیٹھا تھا اور خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔اس نے خود سے سوال کیا۔معاملہ کافی پیچیدہ ہے، یعنی کیا ہوگیا ہے؟

جناب کا معمر شاگرد اپنی چھوٹی سی میز کے پاس سے اُٹھا اور دالان کی طرف چل پڑا۔ خدمت نے گار اس کے چلنے کو نظروں سے پیچھا کیا، پھر اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بوڑھا شاگرد جس نے بڑا سا سفید عمامہ پہن رکھا تھا، کچھ سیڑھیاں نیچے اُترا ہی تھا کہ خادم کی آواز سے مڑا۔آفتاب کی نرم و نازک کرنیں چبوترے کے سامنے پڑی لکڑی کی چٹائی سے ہوتے ہوئے ان کے چہرہ اور ان کی چھوٹی سی جو کھچڑی داڑھی پر ضیاپاشی کررہی تھی۔

خادم نے گھبراتے ہوئے پوچھا:

''مولانا صاحب کو کیا ہوگیا ہے۔جناب کو کہاں جانا ہے؟''

بوڑھے شاگرد نے اپنی انگلی کو انگلیوں میں پھنسایا اور ایسی آواز میں جو گلے کے اندر سے نکل رہی تھی، جواب دیا:

''اپنے شاگرد شیخ علی کے پاس جانا چاہتے ہیں''۔

خادم نے پوچھا:

''ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے کیا''۔

بوڑھے شاگرد نے کمر کو خم کیا اور آخری زینہ سے پیر ہٹایا اور صحن کے بیچ میں موجود حوض کی طرف جاتے ہوئے کہا:

''مجھے معلوم تو نہیں، لیکن بہت ہی اہم مسئلہ ہے''۔

خادم حیرت کے عالم میں کمرہ کی طرف مڑا۔ اچانک ایک آواز نے اس کے ذہن کو گھر کے دروازہ کی طرف متوجہ کیا۔تانگے کی گھنٹی کی آواز تھی۔کمرے کی طرف جانا چاہا کہ جناب کو دروازہ کے درمیان دیکھا۔

جناب جنہوں نے نازک سی سیاہ عبا اپنے دوش پر ڈال رکھی تھی جلدی سے پوچھا:

''شیخ علی کے گھر کا پتہ جانتے ہو؟''

خادم نے فوراً کہا:

''ہاں جناب''۔

جناب نے اپنے عمامہ پر ہاتھ پھیرا اور اپنے عصا کو زمین پر ٹیکا اور خادم کے سہارے دروازہ کی طرف چل پڑے۔ خادم نے دروازہ کھولا اور جناب کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تانگے والا اپنی گاڑی سے نیچے اُترا اور سلام کیا۔ جناب نے گرمجوشی سے اس کا جواب دیا۔ اس نے آقا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ خادم اور تانگے والے نے مل کر ان کو تانگہ پر سوار کیا۔ جناب نے بسم اللہ کہا اور اپنی پوری طاقت کو ضعیف پیروں میں سمیٹا اور احتیاط سے اس کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ خادم بھی ان کے ایک طرف بیٹھ گیا اور وہیں سے تانگے والے سے کہا:

''ہمیں اصلی روڈ پر چلنا ہے''۔

بوڑھے تانگے والے نے اپنے کوڑے کو اپنے دھاری دار گھوڑے کی پیٹھ پر مارنا چاہا مگر جناب کی یاد آتے ہی چابک کو ہاتھ نہیں لگایا صرف گھوڑے کی لگام کو اپنی طرف کھینچا۔

گلی سنسان تھی اور آدمیوں سے بالکل خالی۔ صبح دل انگیز تھی اور چمکتا ہوا سورج گھروں کو رنگ برنگ بنا رہا تھا۔ جناب کی گھنی بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ آنکھیں پرآشوب تھیں۔ خادم کبھی کبھی جناب کو کنکھیوں سے دیکھتا اور زیادہ غمگین ہو جاتا۔ اپنی مٹی کی تسبیح کے دانوں کو گھماتے ہوئے اور ذکر پڑھتے ہوئے اس نے دل میں سوچا: یعنی جناب کو شیخ علی سے کیا کام ہے؟ اس نے کون سا ایسا بڑا گناہ کیا ہے کہ جناب اس قدر غمگین ہیں اور اس وقت علی الصباح ہی چاہتے ہیں کہ اس کے گھر پہنچ جائیں۔

○

تانگہ ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جا کر رُک گیا۔ تانگے والا اور خادم دونوں نیچے اُترے۔ جناب تانگے کے اندر منتظر تھے۔ خدمت گار دھڑکتے دل کے ساتھ قریب

گیا اور آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جناب منتظر تھے اور ان کے ہونٹوں پر درود تھا۔

دروازہ تیزی سے کھلا۔ شیخ علی ایک جوان اور محنتی طالب علم تھا۔ شانے پر عبا ڈالے ہوئے باہر آیا۔ پہلے اس کی نظر تانگے پر پڑی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ خادم کو دیکھا تو تعجب سے سلام کیا۔ خادم نے بھی سلام کیا اور جناب کے بارے میں اسے بتایا۔ شیخ علی چند قدم آگے بڑھا۔ ناگہاں کانپنے لگا۔ فوری تانگے کے پائیدان کے پاس پہنچا اور جناب کو دیکھا۔ جناب نے مہربانی سے سلام کیا۔ شیخ علی کے ہونٹ ہلے اور زبان میں بہت مشکل سے جنبش ہوئی۔ ایسا لگتا تھا آنکھیں کاسۂ چشم سے باہر نکلی آرہی ہیں۔

''علیکم السلام، حضرت استاذ''۔

لگتا تھا وہ اپنا آپا کھو رہا ہے۔ یہ خواب معلوم ہو رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا اس کا استاد اس کے گھر کے سامنے تھا اور ہمیشہ والی محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تانگے کے پہلے پائیدان پر پیر رکھا اور اوپر چڑھا تاکہ جناب کے ہاتھوں کو بوسہ دے۔ جناب نے اجازت نہ دی۔ شیخ علی نے جناب کے زانو پر بوسہ دیا۔ جناب کی روشن آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ شیخ علی بھی رونے والا تھا۔

''جناب اندر تشریف لائیے''۔

جناب نے شیخ علی کے ہاتھوں کو پکڑا۔ خادم اور تانگے والے دونوں متعجب ہوئے۔ جناب تھوڑا جھکے اور اس کے ہاتھوں کو اپنے چہرہ کے قریب لے آئے۔ شیخ علی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کے جسم پر ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ آسمان اس کے سر پر گھوم رہا ہے۔ جناب کی عبا کا نچلا حصہ پکڑا اور رونے لگا۔ اسے ابھی تک یہ پتہ نہیں تھا کہ جناب یہاں کس مقصد سے آئے ہیں اور کیوں اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کر رہے ہیں۔ جناب نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور پدرانہ انداز میں کہا:

''بیٹے! مجھے معاف کر دو۔ میں کل درس میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش

آیا۔ مجھے معاف کردو"۔

شیخ علی کو کل کا سبق یاد آ گیا۔ موضوع اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس کے پیر کانپنے لگے۔ اشک آلود چہرہ سے جناب کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ حوصلہ نہیں تھا کہ جناب کی نظروں کی طرف دیکھے۔ جناب اب بھی اس کے جواب کے منتظر تھے۔ شیخ علی نے بڑی زحمت سے بات کرنے کی کوشش کی۔ روتے ہوئے کہا:

"میں... میں کون ہوتا ہوں کہ آپ کو معاف کروں۔ آپ میرے سیّد و مولا ہیں۔ آپ کو مجھے معاف کرنا چاہئے کیونکہ میں نے آپ کے درس میں اپنے اشکال پر زیادہ اصرار سے کام لیا اور اپنی بات پر اَڑا رہا اور آپ کا وقت برباد کیا"۔

جناب ہنسے۔ جس وقت وہ ہنستے تھے ان کا چہرہ دیکھنے لائق رہتا تھا۔ شیخ علی جناب کی کود میں چلے گئے اور ان کے رونے کی آواز گلی میں پھیل گئی۔

اب جناب کا پیارا چہرہ ہمیشہ کی طرح مسرور و مطمئن ہوگیا تھا۔ تانگہ ایک مترنم ندی کی طرح پتلی گلی میں چل رہا تھا۔

جناب کو سکون مل گیا۔ ابروؤں کی شکن دور ہوگئی۔ خادم بھی اس قدر خوشحال تھا کہ جناب پر سے ایک لمحے کو نظریں نہیں ہٹا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ دل بھر کے دیکھے۔

جناب نے اس کے بعد یہ نذر مانی کہ اگر کسی شاگرد کے ساتھ ایک بار بھی تندی کا مظاہرہ کیا تو پورے ایک سال روزہ رکھوں گا۔ جناب اپنے اطراف کے لوگوں اور شاگردوں سے ہمیشہ لطف و محبت سے پیش آتے تھے۔

○○

میرا حق دو

مسجد ہمہمہ سے بھر جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے بغل والے شخص کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ ایک فقیر نماز گزاروں کی پروا کئے بغیر داد و فریاد کر رہا ہے۔ زیادہ تر لوگ اسے جانتے ہیں۔ یہ ان فقیروں میں سے ہے جو گلیوں اور سڑکوں پر جس کو بھی دیکھتا ہے اس کے پاس چلا جاتا ہے اور پیسہ مانگتا ہے۔ کافی لوگوں کے قول کے مطابق اس کا جنون فقر کی زیادتی کے سبب ہے۔

وہ صفوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ ظہر کی نماز ابھی ابھی ختم ہوئی ہے۔ صفوں میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ شیخ[1] اپنے سر کو بلند کرتے ہیں اور اس پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ فقیر تھوک گھونٹتا ہے اور خود سے کہتا ہے:

"یہی ہے۔ یہی شیخ، یہی جو بہت زیادہ امیر ہے اور کچھ لوگوں کی امداد کرتا ہے۔ انہیں میری بھی مدد کرنی چاہئے، ورنہ اسی جگہ..."

اسے اپنے فقیر دوست کی بات یاد آتی ہے جو چند منٹ پہلے مسجد کے باہر اس سے کہی تھی: شیخ جعفر کچھ فقیر لوگوں کے بیچ پیسہ تقسیم کرتے ہیں۔ قبل اس کے کہ پیسہ ختم ہو جائے تو اپنا حق لے لے۔

وہ شیخ کے سامنے جاتا ہے۔ شیخ تعجب سے اسے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"دو۔ میرا حق دو۔ میں فقیر ہوں"۔

۱۔ مرحوم آیۃ اللہ شیخ جعفر کاشف الغطاء شیعوں کے پارسا اور بزرگ علما میں سے تھے جو عراق میں رہتے تھے۔

مسجد میں سناٹا چھاجاتا ہے۔شیخ اپنا سر جھکا لیتے ہیں۔وہ انتظار کرتا ہے۔اس کے ہاتھ لرز رہے ہیں۔شیخ اطمینان سے کھڑے ہوتے ہیں اور محبت سے کہتے ہیں:

''کاش کہ جلدی آتے۔اب تو کچھ بھی نہیں بچا ہے''۔

وہ آپے سے باہر ہوجاتا ہے اور زور سے چلاتا ہے۔ہاتھوں کی مٹھی باندھ لیتا ہے۔سامنے کی صف میں سے کچھ نماز گزار کھڑے ہوجاتے ہیں۔

''تم جھوٹ کہتے ہو۔میرا حق دو''۔

شیخ فکر میں غرق ہوجاتے ہیں۔وہ خاموش ہوجاتا ہے پھر سامنے آتا ہے اور اچانک شیخ کے نورانی چہرہ پر تھوک دیتا ہے۔لوگ چیخنے چلاّنے لگتے ہیں۔وہ بیہودہ باتیں کہتا ہے۔کچھ لوگ اس کے پاس آتے ہیں تا کہ اس کا ہاتھ پاؤں پکڑ کر مسجد سے باہر کردیں۔شیخ انہیں منع کرتے ہیں۔انہیں زمین پر بٹھا دیتے ہیں اور اپنے عبا کے گوشہ کو ہاتھ میں لیتے ہیں۔پھر مسجد میں گہرا سناٹا چھا جاتا ہے۔لوگوں کا غصہ تعجب میں بدل جاتا ہے۔

شیخ کہتے ہیں:

''جو شخص مجھے دوست رکھتا ہے اس سیّد کی مدد کرے''۔

صفوں میں ہیجان برپا ہوجاتا ہے۔شیخ محبت سے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور ایک چھوٹا سا سکہ باہر نکالتے ہیں اور اس کی عبا میں ڈال دیتے ہیں۔نماز گذاروں کی مٹھیاں ایک ایک کرکے ان کی عبا میں خالی ہونے لگیں۔مرد فقیر کو سکون ملتا ہے۔زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی نگاہ شیخ کے چہرہ پر مرکوز ہوجاتی ہے۔

○○

مہرِ بے پایاں

میدان میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔بغداد کے شیعوں کی ایک جماعت کئی گھنٹوں سے اسمٰعیل ہرقلی کے شوق دیدار میں وہاں جمع تھی۔سامرہ کی طرف جانے والے راستہ کے آخری سرے پر لوگوں کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ناگاہ دور سے گھوڑے کی جھلک نے لوگوں کی نگاہوں کو راستہ کی طرف متوجہ کردیا۔کسی نے کچھ نہیں کہا۔سب لوگ صرف گھوڑے پر سوار اس شخص کے بارے میں سوچنے لگے جو گھوڑا دوڑاتا ہوا میدان کی طرف آرہا تھا۔لوگ اسمٰعیل کو نہیں پہچانتے تھے صرف کچھ چھوٹی موٹی نشانیاں اس کے بارے میں سنی تھیں جو کچھ گھنٹہ قبل سامرہ سے آنے والے چند مسافروں نے اس کے بارے میں دی تھی اور پھر شہر کے بزرگوں نے اس خبر کی تائید کی تھی۔کسی کا بھی دل سینہ میں نہیں تھا۔

گھوڑے پر سوار شخص شہر کے اندر جانے والے میدان تک آپہنچا۔لوگ بغیر کسی تاخیر کے اس کی طرف بڑھے۔اس نے سر پر عربی شال ڈال رکھی تھی اور اپنے چہرہ کو خاکی رنگ کے رومال سے چھپائے ہوئے تھا۔

وہی تھا۔اسمٰعیل ہرقلی۔مگر ابھی کوئی اسے جانتا نہیں تھا۔اسمٰعیل کو شروع میں تو تعجب ہوا اور بے یقینی کے ساتھ ان لوگوں پر نظر دوڑائی، جو یکبارگی اس کے گرد جمع ہوگئے تھے، مگر جلد ہی وہ صورتِ حال کو سمجھ گیا۔اس سے قبل سامرہ میں بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا اور کچھ شیعہ مصافحہ اور تبرک کے لئے اس پر چڑھ گئے تھے۔بھیڑ سے

آسانی سے نجات پانے کے لئے اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کو پوری قوت کے ساتھ کھینچا۔ لوگ جوش مسرت میں اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا رکھے تھے، شور وغل مچا رہے رہے تھے اور تکبیر کہہ رہے تھے۔

اچانک مجمع میں سے کسی نے آواز لگائی:

''اے سوار کیا تو وہی اسمٰعیل ہرقلی حلّی ہے؟''

اسمٰعیل پس و پیش میں تھا کہ کیا جواب دے۔ اگر اثبات میں جواب دیتا ہے تو شاید مشتاق بھیڑ سر پر چڑھ جائے اور وہ ان کے ہاتھ پاؤں کے نیچے کچل جائے۔ اسے پسند نہیں تھا کہ خود کو بآسانی لوگوں کو پہنچوا دے اور سامرہ میں جو واقعہ پیش آیا ویسا ہی واقعہ یہاں پیش آئے۔

اس نے ہوشیاری سے اپنے گھوڑے کے نکل جانے کے لیے ایک پتلا سا راستہ بنایا اور قبل اس کے کہ کہتا میں ایک غریب مسافر ہوں اور بھاگتا، اچانک ایک بوڑھے شخص نے اس کے گھوڑے کی لگام کو پکڑ لیا اور چلایا:

''ارے ہاں، یہ وہی جواں مرد ہرقلی ہے، اس کے سفید پیشانی والے کالے گھوڑے سے پتہ چل رہا ہے۔ وہ امام کی زیارت کر کے آرہا ہے''۔

اسمٰعیل حیران رہ گیا۔ لوگوں نے صدائے تکبیر بلند کی اور دھکا مشتی کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ اسمٰعیل نے نکلنے کی کوشش کی۔ مگر لوگوں نے محاصرہ کے گھیرے کو تنگ کر دیا اور اس کے لیے راہِ فرار بند ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے اسے گھوڑے سے نیچے اُتارنے کی کوشش کی تا کہ تبرکاً اس کے ہاتھ اور چہرے کو بوسہ دیں۔ میدان میں گردوغبار کی ایک دبیز چادر آسمان کی بلندیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسمٰعیل نے کافی زحمت کے بعد خود کو ان لوگوں کے ہاتھ سے چھڑایا۔ ایک کالے بھجنگ جوان نے اس کی عبا پر جھپٹا مارا۔ اسمٰعیل نے اس امر میں خود ہی پیش دستی کی اور مسکراتے ہوئے عبا کو اپنے جسم سے اُتار دیا۔ عبا جلد ہی لوگوں کے ہاتھوں میں

غائب ہوگئی۔

''تبرک کے لیے ہے''۔

''اس عبا سے آقا کی خوشبو آتی ہے''۔

''اس عبا میں سے ایک ٹکڑا مجھ نابینا کو بھی دے دو''۔

کافی لوگ عبا کی طرف دوڑے، پتلا سا راستہ خالی ہوگیا۔ اسمٰعیل تیار ہوا کہ اپنے گھوڑے کو بغداد شہر کی طرف جانے والے راستے کی طرف موڑے۔ جتنا جلد ہو سکے خود کو اس ہجوم سے باہر نکال کر سیّد ابن طاؤس[1] کے پاس جانا چاہئے جو وہاں اس کے انتظار میں ہیں۔ اسی درمیان کچھ گھوڑسوار میدان میں آپہنچے۔ لوگ انہیں دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئے۔ گھوڑے لوگوں کے درمیان سے گذرے اور اسمٰعیل کی طرف آئے۔ اسمٰعیل وہیں ٹھہر گیا۔ لوگ دھیرے دھیرے ان لوگوں سے فاصلہ پر ہوگئے۔ گھوڑے اسمٰعیل کے قریب رُک گئے اور ایک شخص جس نے اپنے چہرہ پر نقاب ڈال رکھی تھی اس کے اشارہ پر زیادہ تر لوگ پیچھے ہٹ گئے۔

اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے کو قابو میں رکھا اور سواروں کو تعجب سے دیکھا۔ اس کی مضطرب آنکھوں میں شوق کی ایک بجلی چمکی، دل چاہتا تھا کہ بال و پر نکل آئیں اور گھوڑے کی پیٹھ سے الگ ہو جائے۔ وہ سیّد تھے جو اپنے گھوڑے کو اس کی طرف لے کر آرہے تھے۔ ان کے ساتھ کے گھوڑے رُکے ہوئے تھے۔ سیّد کا گھوڑا اسمٰعیل کے گھوڑے کے پاس آکر رُک گیا اور دھیرے سے ہنہنایا۔ اسمٰعیل خوش خوش گھوڑے سے نیچے کود پڑا۔ اس حادثہ کے بعد پھر سیّد کو نہیں دیکھا تھا اور کہنے کے لئے بہت سی باتیں تھیں۔

سیّد نے اشتیاق آمیز تعجب سے پوچھا:

۱۔ سیّد بن طاؤس: علی ابن موسیٰ معروف بہ سیّد ابن طاؤس۔ شیعوں کے بزرگ علماء میں سے ہیں جو سنہ ۵۸۹ قمری کو حلّہ میں پیدا ہوئے اور ۶۶۴ قمری میں نجف میں انتقال فرمایا۔

''اسمٰعیل کیا یہ حکایت تم سے متعلق ہے؟''

اسمٰعیل نے غمگین لہجے میں کہا:

''ہاں میرے آقا''۔

سیّد بصد خوشی گھوڑے سے اُتر پڑے۔ اسے اپنی آغوش میں لیا۔ اس کے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اسمٰعیل کی آنکھیں چپکے چپکے رونے لگیں۔ سیّد کی طاقت جاتی رہی۔ اسی جگہ اسمٰعیل کا عربی پیراہن اوپر اُٹھایا اور لاعلاج زخم کی جگہ کو اچھی طرح دیکھا۔

تمام لوگ خاموش تھے اور دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ سیّد کے ساتھ جو سوار تھے انہوں نے بھی تعجب سے اسمٰعیل کی طرف اپنی گردنیں گھمائیں۔ ناگہاں سیّد کا حال دگرگوں ہوگیا۔ ایک چیخ ماری اور اسمٰعیل کی گود میں بیہوش ہوگئے۔ لوگوں نے ادھر ہجوم کیا مگر پاس کھڑے سواروں نے ان کا راستہ روک لیا۔

ایک سوار نے جلدی سے مشک سے پانی لے کر سیّد کے چہرہ پر چھڑکا۔ سیّد کی آنکھیں برابر پھڑپھڑاتی رہیں اور منہ سے کف جاری ہوگیا...

○

اسمٰعیل نے کہا:

''کیا شدید درد تھی۔ جناب۔ اس لاعلاج درد نے میری طاقت چھین لی تھی اور میں اس بات پر راضی بھی ہوگیا تھا کہ جلد ہی موت سے ہمکنار ہوجاؤں۔ جب میں پہلے، دوسرے اور تیسرے ڈاکٹر سے فارغ ہوا تو میری اُمید منقطع ہوگئی۔ تینوں ڈاکٹر اس گہرے سیاہ زخم کو دیکھ کر ہراساں ہوئے اور انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور عجز کا اظہار کیا۔ آہ کیسا جاں فرسا زخم تھا۔ میرے دن و رات اس نے چھین لیے تھے اور درد کے پنجوں نے مجھے زمین پر پٹک دیا تھا''۔

سیّد مسکراتے ہوئے اپنے گھوڑے کو اسمٰعیل کے گھوڑے کے قریب لائے اور

اطمینان سے کہا:

''یہ سب امتحان کی غرض سے تھا۔ وہ بھی اسمٰعیل ہرقلی جیسے ایک اچھے انسان کا امتحان''۔

اسمٰعیل نے اپنا سر جھکالیا اور اپنی کوتاہ پیشانی سے پسینہ پوچھا۔ اس کے کم خطوط والے مگر پررنگ چہرہ پر خستگی کے آثار کو اچھی طرح دیکھا جاسکتا تھا۔ بغداد کی گلیاں اب خالی تھیں اور وہ تمام افراد جو شہر کے ورودی میدان میں تھے اور بیشتر سیّد اور اسمٰعیل کے رہوار کے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔ اب کسی کا اتہ پتہ نہ تھا۔

بغداد کے میدان میں جمع بھیڑ سے الگ ہونے کے کچھ منٹ بعد سید اور اسماعیل عمارت کے باغ میں داخل ہوئے۔ اسمٰعیل میں اب طاقت نہیں تھی۔ خستہ خاک آلود اور کمزور ہوگیا تھا۔ دونگہبان ان دونوں کے گھوڑوں کو چارہ پانی کے لیے وہاں سے لے گئے۔

باغیچہ کے درمیان ایک خوبصورت سا حوض تھا جسے دیکھ کر اسمٰعیل کے مضمحل خیالات میں جان آ گئی۔ دونوں بے اختیار اس حوض کی طرف بڑھ چلے۔ ایک چھوٹا سا فوارہ اس حوض کے بیچ میں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ پانی کی دھار نیچے اوپر ہورہی تھی۔ ایک چھوٹی سی نہر جو پورب کی سمت سے باغیچہ میں بہہ رہی تھی اس سے پانی حوض میں جارہا تھا۔ سرخ و سیاہ رنگ کی مچھلیاں اس کے اندر تھیں۔

اسمٰعیل حوض کے کنارے کھڑا ہوگیا۔ کچھ مرغابیوں نے قاقا کرتے ہوئے اپنے پر پھیلائے اور حوض کے اس طرف جدھر چوڑائی زیادہ اور پانی گہرا تھا مڑ گئیں۔ مگر ایک مرغابی بڑے اطمینان سے بے فکری کے ساتھ پانی میں اپنے پروں کو دھو رہی تھی اور اس کا جوڑا اس کے قریب اپنے سر کو اپنے پروں میں چھپائے ہوئے تھا۔

اسمٰعیل نے سر پر بندھے ہوئے سیاہ عمامے کو سر سے اُتارا اور تھوڑا خم ہوا پھر مرغابیوں کو دیکھ کر مسکرایا۔ اپنے چہرہ کو حوض کے میٹھے پانی میں غوطہ دیا۔ کئی بار یہ عمل انجام دیا۔ سیّد اس کے پاس کھڑے تھے اور جوان حلّی کے بلند قد و قامت کو دیکھ رہے تھے۔

اسمٰعیل نے اپنی عربی عبا اور اپنی گردن اور سر سے گرد و غبار صاف کیا۔ عمامہ کو قرینہ سے سر پر لگایا اور کچھ دیر بعد سیّد کے ساتھ عمارت کے ایک ہال میں خلیفہ کے بڑے وزیر کے پاس آئے۔

عمارت کی راہداری جاذبِ نظر اور دل پذیر تھی۔ دیواروں اور ان پر لٹکے ہوئے لمبے لمبے پردوں پر رنگ برنگی تصویریں منقش تھیں، مگر سیّد اور اسمٰعیل نے اس پر توجہ نہیں دی۔ ایک نگہبان کی راہنمائی میں سیدھے کھڑکی کی طرف گئے جس کے پیچھے وزیر کھڑا تھا۔

وزیر کا چہرہ جو شاید گھنٹوں سے منتظر تھا انہیں دیکھتے ہی خندہ روئی سے پھول کی مانند کھل اُٹھا۔ فوراً ہی ان لوگوں کی رہنمائی کرنے والے نگہبان کو باہر بھیج دیا اور تازہ وارد مہمانوں کو سلام اور خوش آمدید کہا۔ سیّد اور اسمٰعیل اس کے قریب پہنچے اور وزیر کے سلام کا جواب دیا۔ اس عمارت میں کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ اسمٰعیل نے حیران و پریشان ہو کر وزیر پر نظریں ڈالیں۔ سیّد بھی مسکرا رہے تھے۔

وزیر نے اسمٰعیل کو گلے سے لگایا۔ اس کے رخسار کو کئی مرتبہ بوسہ دیا اور کہا:

''بھائی سلام، کتنی اچھی خوشبو آتی ہے۔ یقیناً یہ ہمارے مولا کی خوشبو ہے۔ تمام بغداد میں گھر گھر تمہارے آنے کی خبر پھیل چکی ہے''۔

اسمٰعیل نے سر جھکا لیا۔ وزیر اہل بیتؑ پیغمبر کے شیعوں میں سے تھا جو عباسی خلیفہ کے دربار میں کام کرتا تھا۔ یہ بات سیّد نے اسمٰعیل کو بتائی تھی۔ اسی سبب سے ان دونوں نے وزیر کی دعوت قبول کی تھی اور عمارت میں داخل ہوئے۔

سیّد نے کہا:

''اسمٰعیل میرے قریبی بھائی اور عزیز ترین لوگوں میں سے ہے''۔

وزیر نے ان لوگوں کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ سیّد اور اسمٰعیل بااکراہ ایک بڑے قالین پر بیٹھ گئے۔ وزیر نے پھر کچھ نہ کہا اور ہمہ تن گوش بن گیا۔

اسمٰعیل کو بات کرنے کی نہ تو طاقت تھی اور نہ ہی کوئی شوق تھا، مگر مجبوری سے

کمرے کے تہہ در تہہ کنگروں پر نظریں ڈالیں اور آہستہ آہستہ مگر بے زاری سے گذشتہ روز پیش آنے والے واقعے کو بیان کرنا شروع کیا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ بال و پر نکل آئے ہیں اور وہ سامرہ کی جانب پرواز کر رہا ہے...

○

جس وقت آسمان کی طرف گردن گھمائی، سبز قبا نامی ایک خوش الحان چڑیا اس کی وسعتوں میں گم ہو چکی تھی۔ سبز قبا کی دلنشیں آواز میرے دل پر خوشی کی ایک لکیر چھوڑ گئی تھی۔ شاید وہ بھی ان لمحوں میں پیڑ پر سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میرے لیے زمزمہ پرداز تھی، اس نے کوئی اہم بات کہی تھی اور ایک اہم واقعہ کے رونما ہونے کے بارے میں مجھے باخبر کیا تھا جسے میں نہیں سمجھ پایا تھا۔ ندی ابھی بھی چنگھاڑ رہی تھی۔ پانی کی گڑگڑاہٹ بھی تہہ آب ہنگامہ برپا کیے تھی۔ کھجور کے درخت بھی اپنے وزنی پھلوں سمیت جنگلی صنوبر کے اونچے اونچے درختوں کے ساتھ خمیدہ تھے۔ نہر کے کنارے ہوا اُن کی چھتری کو ہلا رہی تھی اور اس کے قریب ہی یوکلپٹس اور سنترے کے درختوں کے پتوں کو گدگدا رہی تھی۔

اس منظر کو دیکھ کر میرا غم تھوڑا ہلکا ہو گیا۔ میں نے دوبارہ پانی پر اپنی نظریں ڈالیں۔ اپنے بالوں کو اچھی طرح سنوارا، ان میں کنگھی کی، اپنے عربی لباس پر ایک نظر ڈالی اور اپنے سیاہ عمامہ کو اپنے سر پر رکھا پری کی مانند ہلکے پھلکے ہو کر شہر کے باہری حصار کی طرف چل پڑا۔ ابھی آفتاب کو نصف النہار پر پہنچنے میں چند نیزہ کا فاصلہ باقی تھا۔ نسیم کے فرحت بخش جھونکے چل رہے تھے۔

''الٰہی! میں چاہتا ہوں کہ اس سفر میں یہ میرا آخری غسل زیارت کے لیے ہو اور یہ زیارت میری دوسری حیات کا سرآغاز قرار پائے اور یہ سیاہ زخم سے ہمیشہ کے لیے مجھے رہائی مل جائے''۔

میں نے اپنے بائیں پیر پر ہاتھ پھیرا۔ ابھی بھی اس میں درد محسوس ہو رہا تھا۔

اپنی عبا کے اس حصہ پر جو زخم کی طرف تھی نگاہ ڈالی۔ صاف تھی اور اس میں خون لگا ہوا نہیں دکھائی دیا۔ میں نے خود سے کہا، خدا کرے اس زخم کا منھ دوبارہ نہ کھلے اور اس بار پہلے کے مقابلہ میں زیادہ پاک و طاہر ہو کر حرم میں داخل ہوؤں۔

سامرہ شہر میں حرم مثل ایک نگینہ کے تھا۔ اس میں کچھ جاذب نظر چھوٹے کمرے، گنبد کا طاق اور وسیع و عریض صحن جو اس چھوٹی سی بارگاہ کو بڑی محبت سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، میں دو اماموں کی بارگاہ کے بارے میں کہہ رہا ہوں یعنی حرم عسکرینؑ امام ہادیؑ اور امام حسن عسکریؑ۔ ایک ہفتہ ہوا کہ بغداد شہر اور سیّد کے پاس سے ان دو اماموں کی زیارت، مقدس سرداب کی زیارت، استغاثہ اور اس لاعلاج درد کی شفا لینے میں تنہا وطن سے چل پڑا تھا۔ ناسور کے درد اور اس سیاہ زخم کی شفا کے لیے۔ میں سیّد کی طرح حلّہ شہر کا رہنے والا تھا۔ شیعوں کی آبادی والا شہر جو بغداد سے دسیوں کیلومیٹر کی دوری پر ہے، اور کچھ ہی روز پہلے شیعوں کے بزرگ سیّد ابن طاؤس کے ساتھ میں بغداد میں وارد ہوا تھا۔

تمام بزرگ ہستیاں اور کافی لوگ سیّد کو پہچانتے تھے یہاں تک کہ خلیفہ اور ارباب حکومت بھی سیّد سے واقف تھے۔ سیّد ہمارے لیے کس قدر اچھے دوست اور بہترین رہنما تھے، انہوں نے بغداد میں حلّہ کی طرح بہت سے ڈاکٹروں کا پتہ دیا۔ انہوں نے میری ران کے اوپر سیاہ ناسور کا اچھی طرح معائنہ کیا لیکن کسی نے بھی اس کے علاج میں ہاتھ نہ لگایا۔ ناسور اندازاً ہتھیلی برابر بڑا تھا۔ زیادہ تر بہار کے موسم میں سیاہ ہو جاتا اور پھٹ جاتا اور وقت بے وقت اس میں سے پیپ اور خون بہنے لگتا تھا۔

بہار کا موسم تھا۔ زخم پہلے سے زیادہ بڑا تھا اور اس میں درد بھی زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ میرے زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ سیّد سے میں نے کہا تھا کہ اس دردِ لاعلاج نے میری توانائی چھین لی ہے اور بغداد میری آخری منزل تھی۔ سیّد نے انہیں پرسکون اور روشن آنکھوں سے مجھے توکل اور زندگی کی بشارت

دی تھی۔ بغداد میں جب ڈاکٹروں نے مجھے جواب دے دیا تو میرا دل بہت ہی زیادہ بیٹھ گیا اور میں نے سیّد کے ہمراہ واپس حلّہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ بغداد میں ایک حاذق ترین طبیب نے مجھ سے کہا کہ یہ ناسور نازک رگوں پر ہے اور اس کا علاج صرف آپریشن سے ہی ممکن ہے۔ لیکن اگر ناسور کو کاٹتے ہیں تو ممکن ہے رگ بھی کٹ جائے اور اسے جوڑا نہ جا سکے اور اس صورت میں تم زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اس لیے زخم کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔

لہٰذا میں نے اپنا سامان کاندھے پر رکھا اور روانہ ہونے کے لیے اپنے گھوڑے پر زین کسی۔ کہاں! اپنے دیار کی طرف! حلہ!۔

اسی وقت میرے سرور و آقا اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے ہوئے میرے پاس آئے تھے۔

"اسمٰعیل تم اتنی جلدی ہمت ہار گئے۔ بھروسہ رکھو اور اہلِ بیتؑ کی بے پناہ محبت کے بارے میں سوچو"۔

اس چھوٹے سے جملہ نے میرے دل کو منقلب کر دیا۔ ایک انجانے سے احساس نے اس وقت میرے دل کو اپنی مٹھی میں دبایا اور میری نگاہوں کو بغداد کے اس پار موڑ دیا۔ سامرہ دو مظلوم اماموں کا گمنام حرم اور وہ سرداب۔ وہی میرے مولا مہدیؑ کا خانۂ امن۔

میں نے فوراً ہی سیّد سے کہا:

"تو پھر میں دو اماموں اور مقدس سرداب کی زیارت کے لیے روانہ ہوتا ہوں۔ میرے پیسے اور میرا سامان جب تک میں واپس آ جاؤں آپ کے پاس رہے گا۔ اب میرا دل ٹھہرنے کی قوت نہیں رکھتا"۔

اور پھر میں نے اپنے سیاہ رنگ کے گھوڑے کو بے دریغ سامرہ کی جانب مہمیز کیا تا کہ ایک رات صبح تک اپنے غمِ غربت کے ساتھ تنہائی میں حرم کے اندر اور سرداب میں گذاروں۔

صبح کا وقت تھا۔ دجلہ کے پانی میں غسل انسان کو ایک عجیب لذت سے ہمکنار کرتا ہے۔ میں نے اپنی چال بڑھادی۔ ذکر میں مشغول ہوا۔ صلوٰۃ بھیجی۔ دریا کے چاروں طرف سنسان تھا۔ سناٹا اور ہوکا عالم تھا۔ شہر کے حصار کی سنگی دیواروں کے قریب پہنچا۔ بل کھاتی ہوئی نہر دور سے ہی چنگھاڑ رہی تھی۔ اب اس سبز قبا چڑیا کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ سیّد کا خیال دل میں آیا:

''میرے بیٹے! تیری شفا کا نسخہ وہاں ہے، سامرہ۔ وہ سرداب مقدس''۔

دل میں سرداب اور زیارت کی دوبارہ خواہش پیدا ہوئی۔ گذشتہ رات سے زیادہ اس بار راستہ طے کرنے میں میرے پیر کانپے، اور میرے ہونٹ میں نئے سرے سے دعا کرنے کے شوق میں ایک تازہ جان پڑ گئی۔ میں نے کہا:

''کہاں ہیں... وہ.... کہاں ہیں؟''

کچھ گھوڑ سواروں کی آواز نے مجھے اپنی سوچوں سے باہر نکالا۔ حصار کے باہر میں نے نظریں دوڑائیں۔ چست و تیز گھوڑے میری طرف چلے آ رہے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن بند ہو رہی تھی۔ میرے پیروں میں اب جنبش نہیں ہوئی۔ گھوڑے جس وقت نزدیک پہونچے میں نے انہیں بغور دیکھا۔ ایسا لگا کہ عرب کی معزز اور بزرگ ہستیاں ہیں۔ وہ لوگ چست و تیز اور تندرست و توانا گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے میری طرف آ رہے تھے۔

مجھے تشویش ہوئی۔ گھوڑے جس وقت میرے قریب آئے ان کی رفتار ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے انہیں اچھی طرح دیکھا۔ ان میں کے دو آدمی جوان تھے اور ان میں ایک بزرگ تھے جنہوں نے اپنے چہرہ پر نقاب ڈال رکھی تھی اور ایک دوسرا شخص جوان لوگوں میں سب سے آگے تھا۔ اس نے فرجیہ (ایک طرح کا گاؤن) پہن رکھی تھی اور اس میں شمشیر حمائل تھی۔ دوسرے تین سواروں کے پاس بھی شمشیر تھی۔

گھوڑے میرے سامنے آ کے کھڑے ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ کیا کہوں۔ لگتا تھا

مجھ سے کوئی کام ہے۔ سورج کی کرنوں کے ہجوم میں پیر مرد کے نیزہ کی نوک بجلی کی طرح چمکتی تھی۔ فرجیہ پوش آدمی نے مجھے سلام کیا۔ ان دو جوانوں اور پیر مرد نے بھی سلام کیا۔ میں نے بہت احتیاط سے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرجیہ پوش شخص کو بغور دیکھا جن کی نگاہ کی ہیبت میرے لیے عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ محبت بھی تھی۔ انہوں نے پرسکون آواز میں کہا:

''کل تم اپنے گھر والوں کے پاس جا رہے ہو؟''

تعجب سے میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور بے اختیار کہا:

''ہاں آقا''۔

فرجیہ پوش شخص نے کہا:

''سامنے آؤ تا کہ جس چیز نے تمہیں درد و رنج میں مبتلا کر رکھا ہے دیکھوں''۔

مجھے حیرت ہوئی۔ لطیف ہوا کی خنکی گھوڑوں کے بغل سے ہوتی ہوئی میرے جسم کے چاروں طرف مس ہوئی۔ میں غرقِ حیرت تھا۔ میرے دل نے میرے ہاتھوں کو کام میں لگا دیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے مجھے کہا ہو کہ میں اپنی عبا کو اوپر اُٹھاؤں۔ بغیر اس کے کہ کچھ کہوں فوراً ہی اپنی عبا کو اُوپر اُٹھایا اور ان کے قریب گیا۔

فرجیہ پوش شخص جن کا قد و قامت بلند تھا، گھوڑے کے اوپر تھوڑا جھکے۔ ایک ہاتھ میرے شانہ پر رکھا اور اپنا دوسرا ہاتھ میرے زخم کی طرف بڑھایا۔ گھوڑے چپ چاپ کھڑے ہوئے تھے۔ فرجیہ پوش مرد کے گرم ہاتھوں نے اچانک سیاہ زخم کو دبایا۔ مجھے درد ہوا، مگر حیران و پریشان تھا۔ ان کے سخت ہاتھوں پر نگاہیں مرکوز تھیں۔ ان کے اس عمل سے متعجب تھا۔

وہ کون تھے اور یہ عمل کس لیے تھا۔ خون اور پیپ زیادہ مقدار میں زخم سے نکلا، مگر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مرد نے اپنے ہاتھوں کو ہٹایا۔ میں نے فوراً ہی زخم کے خون اور مواد کو ایک کپڑے سے صاف کیا اور اس کا منھ کس کے باندھ دیا۔ عبا سے

اسے ڈھک دیا اور پھر حیرت سے ان سواروں کو دیکھنے لگا۔ ابھی میں ورطۂ حیرت میں غرق تھا۔ صحیح سے غور وفکر نہیں کر پا رہا تھا۔ ان کے غیر مانوس چہرے میرے لیے عجیب اور سوال انگیز تھے۔ ان کی وضع وقطع دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ لوگ سامرہ کے رہنے والے ہیں۔ اچانک پیر مرد کی آواز نے مجھے اپنے خیالوں سے پلٹایا۔

''اسمٰعیل، تمہیں نجات مل گئی''۔

حیران و پریشان ہوا۔ عجیب وغریب فقرہ تھا۔

''کیوں نجات ملی؟''

کسی نے اسی کے متصل میرے کان میں گویا کہا:

''تمہیں نجات ملی... نجات... نجات''۔

میں نہیں جانتا کہ کیا واقعہ رونما ہوا تھا۔ میرا سر بھاری ہوگیا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے چاروں طرف اچھلوں، کودوں۔ فرجیہ پوش شخص کی مسکراہٹ میرے لیے معنی خیز اور عزیز تھی۔ میں نے اس بزرگ کی طرف دیکھا وہ مرد بزرگ کہ جن کی داڑھی سفید اور لمبی تھی میں نے ان کی طرف دیکھا اور بے اختیار جواب دیا:

''ہم اور آپ انشاءاللہ سب رستگار ہوئے''۔

مگر فوراً ہی میں نے اپنا سر جھکالیا اور خود سے کہا:

''لیکن وہ میرا امام کیسے جانتے ہیں؟''

میری سوچ لاحاصل رہی۔ اسی طرح حیرانی کے عالم میں پہلے پیر مرد اور اس کے بلند نیزہ اور پھر فرجیہ پوش شخص کو بغور دیکھا۔ اچانک پیر مرد نے عجیب بات کہی۔ ایسی بات کہ جس نے میرے پورے وجود کو تابناک کر دیا۔

''یہ بزرگوار تمہارے امامِ زمانہؑ ہیں''۔

''وہ...''

میری زبان میں عجیب طرح کی لکنت پیدا ہوگئی۔ ٹھنڈے پسینہ سے میرا پورا جسم

تر بہ تر ہوگیا۔ میرے پیروں اور کمر میں لرزہ پیدا ہوگیا۔ اچھی طرح فرجیہ پوش شخص کو دیکھا۔ اچانک ہوا میں اُڑتے ہوئے پتّے کی طرح سے میں اپنی جگہ سے اُچھل پڑا اور خود کو فرجیہ پوش کے قدموں پر گرادیا۔ یہ سارا عمل بے اختیاری میں ظہور پذیر ہوا۔ میرا دل مضطرب اور پریشان تھا۔ چاروں طرف اچھی طرح نظریں دوڑائیں پھر آسمان کی طرف دیکھا اور اس وقت ان کی طرف نظریں گھمائیں۔ وہ صبح بہت ہی روشن تھی اور سامرہ شہر کے باہر۔ شہر کے بلند حصار کے نزدیک نہ آسمان کا رنگ بدلا تھا نہ زمین اور نہ اس کے اِردگرد کی چیزیں۔ تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ پر تھیں۔ پھر ہمارے مولا اس جگہ کیا کر رہے تھے۔

یہ بہت ہی اہم سوال تھا جو آگ کی مانند میرے دماغ میں شعلہ ور تھا۔ میرے شوق کی آگ نے میرے وجود کو سوزناک کر دیا تھا۔ میں نے مولا کے ہاتھوں اور پیروں کو بوسہ دیا اور آنسوؤں سے بھر دیا۔ اور مستقل روئے جا رہا تھا۔ ذہن میں آیا کہ امام کو اچھی طرح سے دیکھوں اور ان کی پیشانی کو اپنے دل میں بسالوں تا کہ زیادہ سے زیادہ اس سے لذت حاصل کرسکوں۔ بس چاہت کی پیاس میں ایک ٹک انہیں دیکھتا رہا۔

گھوڑے اپنے راستہ پر چل پڑے اور میں ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ امام مڑے اور بہت ہی مہربانی سے مجھ سے فرمایا:

''واپس جاؤ''۔

میں نے پھر امام کے پیروں کو پکڑلیا اور روتے ہوئے کہا:

''آپ سے ہرگز جدا نہیں ہوں گا۔ امام نے فرمایا، مصلحت اسی میں ہے کہ لوٹ جاؤ''۔

میں نے ایک چیخ ماری۔ گھوڑے بڑے سکون کے ساتھ زمین پر ٹاپیں مار رہے تھے اور آہستہ آہستہ شہر کے حصار سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ پیر مرد نے گھوڑے پر سے ہی اپنے دھڑ کو میری طرف موڑا اور زور سے کہا:

''اسماعیل، کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ تمہارے امامِ زمانہ نے دو مرتبہ تمہیں لوٹ جانے کو کہا اور تم ان کے حکم کی مخالفت کر رہے ہو''۔

میرا دل بیٹھ گیا۔فوراً ہی کھڑا ہوگیا اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطروں کے درمیان امام کو دیکھا۔امام کی قامت سواروں کے درمیان بلند اور چشم نواز تھی۔اسی لحظہ امام کا آخری کلام گھوڑے کی پشت سے پرندہ کی مانند میری طرف اُڑ کر آیا۔

''جس وقت تم بغداد پہنچنا ابوجعفر خلیفہ جس کا نام مستنصر ہے تمہیں بلائے گا۔اس کے پاس جانا لیکن تمہیں کچھ دے تو قبول نہ کرنا اور ہمارے بیٹے علی ابن طاؤس سے کہنا کہ ایک خط تمہارے بارے میں علی ابن عوض کو لکھیں۔ میں بھی ان کے سپرد کرتا ہوں کہ جو کچھ بھی تمہیں چاہیے وہ دے دیں''۔

گھوڑے اسی انداز میں دھیرے دھیرے دور ہوتے چلے گئے اور میں حسرت و اندوہ کی ایک دُنیا لیے ہوئے کھڑا رہ گیا۔اب اس بیابان میں اور کچھ دِکھائی نہ دیتا تھا۔ آنسوؤں کو اپنے تمتماتے چہرہ سے صاف کیا۔خدایا کس قدر عجیب تھی یہ بات کہ سب کچھ حالتِ بیداری میں رونما ہوا... بیداری میں...!

افسوس سے میں تھوڑی دیر کے لیے زمین پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔مولا کی آسمانی صورت نظر سے دور نہیں ہورہی تھی۔ان کی دلنشین آواز کی نہر ابھی بھی میرے کانوں میں جاری تھی۔بڑی مشکل سے اپنی جگہ سے اُٹھا۔پیروں میں بہت زیادہ نقاہت تھی۔ دھیرے دھیرے دروازہ کی طرف بڑھا اور شہر کے اندر داخل ہوگیا۔

حرم میں پہنچا، سلام کیا اور زور زور سے رونا شروع کیا۔ناگہاں دو خادم میرے پاس دوڑتے دوڑتے آئے۔میری پریشان حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔میں نے ان لوگوں سے بے پروا اپنے عمامہ اور بکھرے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔کچھ اور خادم بھی آگئے، وہ پچھلی رات سے مجھے پہچانتے تھے اور میرے پیر کے زخم کو انہوں نے دیکھا تھا۔ان میں سے ایک نے کہا:

''کیا بات ہوگئی ہے۔کیا کسی نے تم سے جھگڑا کیا ہے''۔

میں نے آہستہ سے کہا:

''نہیں''۔

پھر میں نے اپنی انگلی سے حصارِ شہر کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا:

''کیا تم نے ان سواروں کو جو شہر سے باہر گئے ہیں دیکھا ہے؟ اور کیا ان کو پہچانتے ہو؟''

خادموں نے کہا:

''ہاں، وہ چار سوار ہمارے خیال میں وہ عرب کے بزرگوں میں سے تھے''۔

میں ایک پھیکی سی ہنسی ہنسا اور کہا:

''نہیں، نہیں، ان میں سے ایک امامِ عصرؑ تھے''۔

ایک بوڑھے خادم نے گردن اُچکائی اور حیرت سے پوچھا:

''وہ پیر مرد یا وہ شخص جس نے فرجیہ پہن رکھا تھا۔ان میں سے کون تھے؟''

میں نے شدید رنج سے کہا:

''وہ جنہوں نے فرجیہ پہن رکھا تھا''۔

بوڑھے خادم نے پوچھا:

''اپنے ناسور کے زخم کو انہیں دِکھایا؟''

اچانک میں ٹھہر گیا اور اپنے پیروں کے زخم کے بارے میں سوچنے لگا اور پھر غور و فکر کے بعد کہا:

''ان بزرگوار نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے پکڑا اور زور سے دبایا، اس طرح کہ مجھے درد کا احساس ہوا اور پیپ و خون اس سے زیادہ مقدار میں نکلا''۔

پھر میں نے گھبراہٹ میں اپنی عبا کو اوپر اُٹھایا۔ایک عجیب چیز دیکھی۔خادموں

نے اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔ میں نے زخم کی سوکھی کھال کی جگہ پر ہاتھ پھیرا۔ میرا ہاتھ خشک ہوگیا۔ خادموں کے منھ سے بے انتہا تعجب سے آواز نکلی:

''آہ! اللہ اکبر!''

''عجیب ہے۔ وائے''۔

شک ہوئی کہ شاید زخم دوسرے پیر کے اوپر تھا۔ اُس طرف کی عبا اُٹھائی۔ عجیب بات تھی کہ اس سیاہ زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ دونوں پیر سالم اور بے نقص تھے۔ دو زانو زمین پر گر پڑا اور نالہ کیا۔ خادموں نے اللہ اکبر کہتے ہوئے مجھے اپنی کود میں اُٹھالیا۔ عمامہ اور میری اُونچی لمبی دستار میرے سر اور ہاتھ سے چھین لے گئے اور میں خادموں کے نرغے میں فقط روتا رہا اور چیخ مارتا رہا۔ اس اُونچی دستار اور عمامہ سیاہ کی ان کے ہاتھوں تکابوٹی ہوگئی۔ لوگوں کی ایک جماعت بھی جو وہاں نزدیک موجود تھی ان ٹکڑوں کے پیچھے دوڑ پڑی۔ خادموں میں سے دو لوگ مجھے لوگوں کی نظروں سے چھپا کر خادموں کی سرائے کی طرف لے گئے۔

○

اسماعیل کو کمرہ میں ٹھہرنے کی طاقت نہ تھی۔ اس کا جسم تپ آلود اور پسینہ پسینہ ہوگیا تھا۔ وزیر کے لٹکے رخسار سرخ اور نم تھے۔ وزیر نے اسمٰعیل سے گذارش کی کہ اپنے زخم کی جگہ کو دِکھائے۔ اسمٰعیل نے اپنی عبا کو اوپر اُٹھایا، اس سیاہ زخم کا کچھ بھی نشان نہ تھا۔ وزیر نے حیرت سے اپنی انگلی دانتوں تلے دبالی اور فوراً ہی کارندوں کو آواز دی کہ عمارت کے طبیبوں کو یہاں لے کر آئیں۔

کچھ لمحوں بعد تین طبیب کمرہ میں وارد ہوئے اور ان تینوں نے تعجب سے اسمٰعیل کو دیکھا۔

اسمٰعیل کافی تھک چکا تھا۔ وزیر نے اسمٰعیل کے پیر کے بالائی حصہ کو اُنہیں دِکھایا۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

وزیر نے پوچھا:

''انہیں پہچانتے ہو؟''

سب نے ہاں میں اپنے سر کو ہلایا اور ان میں سے ایک نے کہا:

''ہاں، وہیں گہرے زخم والا بیمار، وہی نہ جس کے پیر میں ایک بڑا اور کالے رنگ کا زخم ہے؟''

''اس کے زخم کو کب دیکھا تھا؟''

''چند روز قبل''۔

طبیبوں نے اسمٰعیل کے پیر کو اچھی طرح دیکھا۔ ان میں سے ایک چلایا:

''یہ کام صرف عیسیٰ ابن مریم کا ہے''۔

وزیر ہنسا اور جواب دیا:

ہمیں معلوم ہے کہ کس بزرگ اور شائستہ ہستی کا یہ کام ہے''۔

○

سورج ڈوبنے والا تھا کہ اسمٰعیل اور سیّد وزیر کے ساتھ عمارت کے اصلی محل میں وارد ہوئے۔ مستنصر عباسی محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے استقبال کے لیے آیا۔ اسمٰعیل سے ملتے ہی بغیر کسی تمہید کے سامرہ والے واقعہ کے بارے میں پوچھا۔ اسمٰعیل نے اپنی شفا کی داستان خلیفہ کو پھر سنائی۔

خلیفہ جس کے قیافہ سے حیرت ٹپک رہی تھی، کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ صرف تھوڑا سا چہل قدمی کی۔ پھر ایسا لگا کہ کوئی خیال اس کے دل میں آگیا ہے۔ فوراً حکم دیا کہ خادم سونے کے ہزار دینار لے کر آئے۔ پیش خدمت قریب آیا اور منھ بند تھیلی خلیفہ کے ہاتھ میں رکھ دی۔ خلیفہ نے اسمٰعیل کی طرف رُخ کیا اور کہا:

''ان اشرفیوں کو اپنے سفر کے اخراجات کے لیے لے لو''۔

اسمٰعیل نے بہانہ کیا، امام کی اس روز والی بات کو ذہن میں رکھا اور کہا:

''اجازت نہیں ہے کہ ذرّہ برابر بھی اس میں سے اُٹھاؤں''۔

خلیفہ حیران ہوا اور تعجب سے پوچھا:

''کس سے ڈرتے ہو؟''

اسمٰعیل نے جواب دیا:

''اس شخص سے جس نے مجھے شفا عنایت کی کیونکہ انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ابوجعفر سے کچھ قبول نہ کرنا''۔

خلیفہ شرمندہ ہوا اور اپنی خول میں سمٹ گیا اور اپنی لمبی چوڑی اور قیمتی قبا میں اپنے سر کو چھپا لیا۔ سیّد کے ہونٹوں پر ایک اندرونی ہنسی تھی۔ وزیر بھی خاموش تھا اور کنکھیوں سے خلیفہ کو دیکھ رہا تھا۔ خلیفہ رونے لگا۔ اپنے گلدار رومال سے آنسوؤں کو اپنی خمار آلود آنکھوں سے پوچھا اور خدا حافظ کہے بغیر جلدی سے محل کے باہری حصہ کی طرف چل پڑا۔

○○

بچہ کی گمشدہ چیز

بچہ برابر روئے جا رہا تھا۔ ماحول تاریک ہو چکا تھا اور شہر سیاہی وظلمت کے درمیان نیند کی آغوش میں جا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنی شروع ہوگئی تھی۔ شہر کے لوگ جو زیادہ تر کسان اور پیشہ ور تھے، شام کو ہی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں مشکل سے کچھ دکھائی دیتا تھا۔ لوگوں کو اگر رات کے وقت کہیں جانا ہوتا تھا تو اپنے ہاتھوں میں چراغ لے کر چلتے تھے۔

بچہ ایک اندھیری گلی میں بالکل تنہا تھا۔ وہ بے چین تھا۔ اس کی آنسو بھری آنکھیں چاندنی رات میں زمین پر تیزی سے کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس تاریکی میں کسی چیز کو تلاش کر رہا تھا، مگر اس کی کھوئی ہوئی شے کا کچھ بھی اتہ پتہ نہیں تھا۔

بچہ نے کئی بار اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے زمین کو ٹٹولا مگر کچھ حاصل نہ ہوا اور اس کا رونا دھونا زیادہ ہوگیا۔ گلی کے اِس نکڑ سے لے کر اُس نکڑ تک کو اس نے چھان مارا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ گھر لوٹ چلے، لیکن اپنے باپ کو کیا جواب دے گا۔ اس نے بچہ کو کچھ خریدنے کے لیے گلی کے نکڑ پر بنئے کی دُکان پر بھیجا تھا اور اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ بچہ کا رونا اور بڑھ گیا تھا۔ زور سے رونے کی وجہ سے اس کو سانس لینے میں پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ کر ہی کیا سکتا تھا کوئی راہ حل نہیں تھا۔ گلی کے نکڑ سے ایک چراغ کی روشنی دِکھائی دینے لگی، جس نے بچہ کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ بچہ تھوڑا ٹھٹکا۔ دیوار کے پاس چلا گیا اور چراغ کی روشنی کو جو ہر لحظہ قریب تر ہوتی

جارہی تھی دیکھنے لگا۔ وہ کون تھا۔ بچہ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کا رونا بند ہوگیا۔ اور اس شخص کو جو آرام آرام سے قدم اُٹھاتا ہوا نزدیک آرہا تھا غور سے دیکھنے لگا۔

چند لمحوں بعد ایک سیّد مولانا جن کی داڑھی سفید تھی اور عصا کے سہارے راستہ طے کررہے تھے، اس کے پاس پہنچے، اس پر نظر ڈالی۔ سلام کیا اور آرام سے چل پڑے۔ بچہ نے ان کی آنکھوں میں کیا دیکھا تھا۔ شاید وہ اپنے چراغ کی روشنی میں اس کی مدد کو آئیں اور اس کا پیسہ ڈھونڈھ نکالیں۔ بچہ دوبارہ رونے لگا۔ مولانا جو اس سے چند قدم دور ہو چکے تھے اس کے رونے کی آواز سن کر اپنی جگہ کھڑے ہوگئے۔ آہستہ سے اپنے سر کو گھمایا اور بچہ پر نگاہ ڈالی۔ پھر اس کے قریب آئے اور محبت سے پوچھا:

''بیٹے کیا ہوگیا ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟''

بچہ نے مولانا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

''جناب، میرا پیسہ گم ہوگیا ہے۔ میرے والد نے مجھے پیسہ دیا تھا کہ نکڑ کے دُکاندار سے سامان خرید لاؤں مگر وہ پیسہ یہیں پر کھوگیا''۔

مولانا مسکرائے اور اپنے ہاتھوں سے بچہ کے تر چہرہ کو صاف کرتے ہوئے کہا:

''اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ آؤ، اس چراغ کی روشنی میں ہم دونوں مل کر تمہارے پیسے کو تلاش کرتے ہیں، شاید مل جائے''۔

مولانا نے یہ کہنے کے بعد اپنی عصا کو دیوار کے پاس کھڑا کردیا۔ کمر کو بڑی مشکل سے خم کیا اور چراغ کا رُخ زمین کی طرف کیا۔ دونوں کام میں لگ گئے۔ بچہ اب نہیں رو رہا تھا بلکہ سرگرمی سے زمین پر ڈھونڈھ رہا تھا۔ مولانا نے تلاش کے دوران کئی مرتبہ مسکراتے ہوئے بچہ کو دیکھا اور اپنی میٹھی بول سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

کچھ دیر گزر گئی، مگر پیسہ کا پتہ نہیں چلا۔ بچہ نے نا اُمیدی سے مولانا کو دیکھا۔ انہوں نے اپنے چراغ کو اور زیادہ زمین کے قریب کردیا اور کہا:

''اگر دعا کرو گے تو انشاءاللہ مل جائے گا''۔

انہوں نے اپنی کمر کو اور زیادہ جھکاتے ہوئے ہاتھوں سے زمین ٹٹولی۔ بچہ جو دونوں ہاتھ کو اپنے زانو پر رکھ کر جھکا ہوا تھا مولانا کے اس عمل سے متعجب ہوا۔ آخر یہ کون تھا جسے بچہ نے اب تک نہیں دیکھا تھا، جس کے وجود میں ایک عجیب سا سکون تھا اور محبت اس کے نورانی چہرہ سے ٹپک رہی تھی۔ بچہ اُنہیں خیالوں میں گم تھا کہ ناگاہ مولانا نے محبت سے اسکا طرف دیکھا اور کہا:

''پروردگار تیرا شکر ہے۔ دیکھو میں نے ڈھونڈ نکالا''۔

پھر پیسہ کو بچہ کے ہاتھ میں تھمایا، مہربانی سے اُس کی پیٹھ تھپتھپایا اور کہا:

''دیکھا، آخر مل گیا نا''۔

''مگر تم نے اپنا نام مجھے نہیں بتایا''۔

''میں علی ہوں جناب''۔

مولانا کا چہرہ اور محبت آمیز ہوگیا اور کہا:

''علی، کیا خوبصورت نام ہے۔ جلدی کرو علی جان۔ ممکن ہے دیر ہوجائے۔ جاؤ، دُکاندار اپنی دُکان کہیں بند نہ کردے''۔

ایک دلنشیں مسکراہٹ بچہ کے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔ ایک نظر اپنے پیسہ پر اور ایک تشکر آمیز مولانا پر ڈالی۔ انہیں خدا حافظ کہا۔ پھر تیزی سے بنیے کی دُکان کی طرف چل پڑا۔ مولانا نے بھی اپنے عصا کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور آہستہ آہستہ اور آرام سے آگے بڑھ گئے۔ بچہ جب بنیے کی دُکان پر پہنچا تو اُس نے سر گھمایا اور گلی کے آخری سرے پر اپنی نظریں دوڑائیں۔ مولانا کو دیکھا کہ جھکے ہوئے دھیرے دھیرے قدم اُٹھا رہے ہیں اور رات کی سیاہی میں دور ہوتے جارہے ہیں۔ وہ شیعوں کے مرجع تقلید آیۃ اللہ العظمیٰ سیّد محمد تقی خوانساری[1] تھے۔ مگر بچہ انہیں نہیں جانتا تھا۔

○○

۱۔ سیّد محمد تقی خوانساری: آیۃ اللہ بروجردی سے قبل حوزۂ علمیہ قم میں شیعوں کے تیسرے مرجع تھے۔

کس لیے ڈرنا

کمرے کے باہر بڑے باغیچے کے پاس سیّد ابوالحسن نے شدید اشتہا سے اپنے تانبے کے برتن پر نظر ڈالی اور کہا: ''کیا مہک ہے۔ کیا خوشبو ہے''۔ پھر بیٹھ گئے اور اپنے چھوٹے سے چاقو سے پیالے میں پڑے بہی کو کاٹا اور خیالوں میں کھو گئے۔ اپنے دوست سیّد حسن[1] کے لیے بہترین آبگوشت تیار کرنا چاہیے تاکہ مہینوں اس ہاتھ کے پکے آبگوشت کی لذت سیّد حسن کے ذہن میں باقی رہے۔

پہلے بہی کے چھلکے اتارنے کے بعد، دوبارہ وہی خوشبو ان کے دماغ میں گھوم گئی۔ خود سے کہا:

''اگر سید حسن نے بہانہ بنایا کہ یہ کھانا امیروں کا کھانا ہے اور کیا اور کیا، تو میں کہوں گا کہ کئی سال بعد بغیر گوشت کے آبگوشت کھانا چاہا اور تم نے .....میزبان کی حرمت کو ضایع کرنا اچھی بات نہیں ہے''۔

اچانک ایک شخص اس کے سر کے پاس کھڑا ہوگیا۔ بہت ہی دُبلا پتلا اور لمبے

۱۔ سیّد حسن: شہید آیۃ اللہ سیّد حسن مدرّس رضا خاں کے زمانہ کے ایک عالم اور ممتاز سیاستداں تھے۔ وہ ۱۲۷۸ قمری میں ایک گاؤں سرابہ کجوا ردستان میں پیدا ہوئے۔ رضا خاں کے زمانہ میں ان پر کئی مرتبہ جان لیوا حملہ ہوا لیکن مبارزہ سے ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ آخر میں خواف شہر بھیج دیئے گئے۔ دس سال وہاں رہے۔ پھر رضا خاں کے فرمان سے کاشمر کے قیدخانہ میں قید کردیئے گئے اور ۱۳۱۶ شمسی شاہ کے اہلکاروں کے ہاتھوں زہر دیا گیا اور شہید ہوگئے۔

قدوقامت کا۔ اور اسے گھورنے لگا۔

سیّد ابوالحسن نے اس کی طرف دیکھا۔ اجنبی اور مشکوک آدمی لگ رہا تھا۔ مدرسہ کے طلبا میں سے نہیں تھا۔ بلند قدوقامت کا تھا۔ پرانی، سر پر کول ٹوپی اور ریشمی دستار سے ڈھکا ہوا چہرہ۔

سیّد ابوالحسن تھوڑا ڈرے۔ اس مرد کی گھورتی آنکھیں دو تیر کی طرح تھیں، جو اُن کی طرف پیوست ہوا چاہتی تھیں۔ وہ کچھ نہیں کہہ رہا تھا اور سیّد ابوالحسن کے چاقو اور بہ کے موٹے تازے دانوں کو جو پیالہ کے اندر پڑے تھے بغور دیکھ رہا تھا۔

سیّد ابوالحسن نے محسوس کیا کہ یہ اجنبی شخص ان کے پاس سے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے گھبرا گئے پھر کمروں کی طرف نظر دوڑائی۔

صبح کا وقت تھا۔ صحن میں ابھی کوئی نہیں تھا۔ مدرسۂ جدۂ بزرگ کے تبریزی اور چنار کے درختوں کے پتوں پر پرندے پھدک پھدک کر چہچہا رہے تھے۔

وہ شخص سیّد ابوالحسن کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا اور کہا:

''سلام آقا سیّد ابوالحسن''۔

سیّد ابوالحسن کی تشویش دوچند ہوگئی۔ یعنی اس کو کہاں سے جانتا تھا۔ کس قدر بھدی اور بھونڈی آواز تھی۔ اشرار میں سے لگتا تھا۔ سیّد ابوالحسن نے چاقو کو کس کے اپنے ہاتھوں میں پکڑلیا۔

''تم کون ہو؟ میں تمہیں نہیں پہچانتا''۔

مرد اجنبی ایک بے جان سی ہنسی ہنسا اور جواب دیا:

''ایک اجنبی آدمی۔ مجھے جلدی چلے جانا چاہیے۔ صرف میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سیّد حسن مدرّس سے کہہ دیجیے کہ آج دوپہر آپ کے یہاں مہمان نہ ہوں''۔

سیّد ابوالحسن کے ہاتھوں سے چاقو چھوٹ گیا اور تانبے والے برتن میں جا گرا۔ خود

سے کہا آخر وہ ہے کون؟ اسے کیسے معلوم ہوا کہ سیّد حسن میرے مہمان ہیں۔ پھر اس سے پوچھا کیوں آج میرے مہمان نہ ہوں؟

اس شخص نے اپنے انگوٹھے کے کالے ناخن کو اپنے پیروں کے نیچے پڑی ایک اینٹ پر کھینچا۔ اپنے اِردگرد کی فضا اور ماحول کو اچھی طرح پرکھا پھر کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

''کچھ لوگوں کو آج انہیں قتل کرنے کا حکم ملا ہے۔ مجھے بھی حکم ملا تھا، مگر مجھے سید پر رحم آ گیا اور میں پشیمان ہوگیا۔ اب یہی بتانے آیا ہوں تا کہ جتنا جلدی ہو سکے یہ خبر آپ انہیں دے دیں۔ سیّد بہت جلدی''۔

پھر مدرسہ کے دروازہ کی طرف چل پڑا اور بڑے اطمینان سے پھر کہا:

''بھول نہ جانا۔ انہیں جلدی خبر کردو۔ اگر وہ یہاں آ گئے تو ظہر کے وقت قتل کردیئے جائیں گے''۔

اب سید ابوالحسن، مدرسہ جدہ کے جوان اور متوسط القامت طالب علم کا ہاتھ اور زانو لرز رہا تھا اور ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ وہ اجنبی آدمی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سیّد ابوالحسن پسینہ پسینہ ہوگئے تھے۔ دل بہت بے چین تھا۔ کھڑے ہوئے مدرسہ کے صحن اور تمام جگہوں پر اچھی طرح نظر دوڑائی۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ یعنی وہ کون تھا۔ یقیناً انہیں اشرار لوگوں کی جماعت میں سے تھا۔

اچانک پیالہ کو اُٹھایا اور حجرہ کی طرف دوڑے اور جھک کر اس میں داخل ہوئے۔ فورا چھوٹے مدرسے جدہ جانا چاہئے جو ان کے مدرسے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اپنے دوست سیّد حسن تک اس اہم خبر پہونچانا چاہئے۔ ان کے دل کو یقین تھا کہ خبر درست ہے کیونکہ سیّد حسن شہر کے جانے پہچانے طلبا میں سے تھے اور اکثر و بیشتر اربابِ حکومت اور زمینداروں سے ان کی جھڑپ ہوجاتی تھی اور وہ لوگوں کو ان کے خلاف ورغلاتے تھے۔ کئی مرتبہ دشمنوں نے ان کو مار ڈالنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر خدا نے نہیں چاہا تھا اور وہ ان کے چنگل سے بچ گئے تھے۔

سیّد ابوالحسن نے اپنی عبا کو اپنے شانہ پر ڈالی چھوٹے سے عمامہ کو سر پر رکھا اور بغیر کسی تاخیر کے فوراً ہی چھوٹے مدرسہ کی طرف چل پڑے۔

○

سیّد حسن ہنسنے لگے اور کہا:

''اتنی جلدی اپنی بات سے پلٹ گئے۔ یعنی ایک فقیرانہ کھانا اتنا خرچیلا ہوتا ہے''۔

سیّد ابوالحسن جو دروازہ کے بیچوں بیچ کھڑے تھے اپنی چھوٹی سی پیشانی سے پسینہ پوچھا اور گھبراتے ہوئے کہا:

''مذاق مت کرو سیّد، اس اجنبی آدمی کی دھمکی پُرمعنی اور اہم تھی۔ تم آج... میری زبان کٹ جائے۔ اگر آئے تو قتل کردیئے جاؤ گے''۔

سیّد حسن دوبارہ ہنسے مگر اس بار پہلے سے زیادہ زور سے۔ پھر ان کے قریب گئے۔ ان کے دونوں بازوؤں کو پکڑا۔ انہیں کمرہ کے اندر لے گئے۔ انہیں اپنے چھوٹے سے کمرہ میں بٹھایا، جہاں ان کا بستر اور تکیہ سمیٹ کر رکھا ہوا تھا تا کہ اس سے ٹیک لگا سکیں۔

سیّد ابوالحسن نے دوبارہ خائف ہوکر اور زور دے کر کہا:

''سیّد تم دشمنوں کی نظر میں ہو۔ اب ان میں کا ایک آدمی خود چل کر آیا ہے اور یہ خبر لایا ہے۔ تم اپنی جان کی حفاظت کے لیے سہی آج نہ آؤ''۔

سیّد حسن نے اپنی چھوٹی سی چینی کی کیتلی سے ایک پتلی سی کمر والی لمبی پیالی میں چائے اُنڈیلی۔ استکان کو زرد رنگ کی چھوٹی سی سینی میں جس میں صرف ایک استکان رکھنے کی گنجائش تھی رکھا اور پھر اسے اپنے جوان دوست کے سامنے پیش کیا۔ چاندی کا شکردان سامنے رکھا اور اطمینان کے ساتھ کہا:

''تو یہ معاملہ کافی دلچسپ ہے اور آج کے کھانے کی خاطر نہیں''۔

اس کے بعد دروازہ کی سمت گئے اور اس کے صاف شفاف شیشہ کے پیچھے سے

حوض کے کنارے سرو کے درخت پر نظریں گاڑ دیں اور زور دے کر کہا:

''آقا سیّد، آپ مطمئن رہیں، میں اس سرو کے درخت سے کمتر نہیں ہوں جو چار ناہنجار دشمن کے سامنے جھک جاؤں۔ یہ سرو کا درخت طوفان کے سامنے اپنی کمر خم نہیں کرتا۔ ہلکی پھلکی ہوا اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔''

سیّد ابوالحسن انہیں دیکھتے رہ گئے، پھر کچھ نہیں کہا اور قند کو تر کر کے اپنے خشک منھ میں ڈالا اور دارچینی والی چائے جو استکان میں تھی اسے پیا۔

سیّد حسن نے ایک بڑی سی کتاب کھولی اور اپنی تیز آنکھوں سے اسے پڑھنا شروع کیا۔ سیّد حسن نے محبت پاش نگاہوں سے انہیں دیکھا اور کہا:

''اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری جگہ دعوت کروں تو کوئی بات نہیں۔ مگر میں آؤں گا ہمارے پروگرام کو درہم برہم نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ مالک ہے''۔

سیّد ابوالحسن اب کچھ نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ایسا لگتا تھا گویا کچھ دیر پہلے جو گھبراہٹ ان میں تھی وہ کم ہو گئی تھی۔

''میں مدرسہ جا رہا ہوں۔ راستہ میں لوگوں کے بیچ سے ہو کر آنا۔ سنسان گلیوں سے نہ آنا''۔

سیّد حسن کا چہرہ دوبارہ ہنستے ہوئے کھل اُٹھا۔ ان کے متناسب اور صاف دانت چمکنے لگے۔ سیّد ابوالحسن نے ان کے شانہ کو دبایا اور کمرہ سے باہر نکل گئے۔ سیّد حسن ان کے احترام میں ان کے پیچھے چلے اور اپنے ہاتھ موجود کتاب کو کھولا اور کہا:

''میں ان دو صفحوں کو پڑھ کر آتا ہوں''۔

ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ مدرسہ کا صحن درس و بحث سے فارغ ہو کر آنے والے طلباء سے بھرا ہوا تھا۔ سیّد ابوالحسن شیشہ کے پیچھے سے صحن میں موجود لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ تمام طلبا کو اچھی طرح نہیں پہچانتے تھے۔ ان کو پھر سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ان کو بے چینی ہو رہی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ وہ واقعہ رونما ہو جائے اور ان کے مہمان سید حسن .....

ان کے دل کو سکون نہیں تھا۔ کمرہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ کئی مرتبہ صحن میں گئے۔ صحن میں ٹہل رہے کچھ لوگ انہیں مشکوک نظر آئے۔ مگر فوراً ہی کمرہ میں واپس چلے گئے اور پھر منتظر رہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا صحن میں چل رہی تھی اور پتوں سے ڈھکے درختوں کے پیراہن کو دھیرے دھیرے ہلا رہی تھی۔ پختہ بہی کی خوشبو ان کے چھوٹے سے کمرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیّد ابوالحسن کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی سے مدرسے کے لکڑی کے بڑے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ان کی آنکھ کول ہوگئی۔ خود سیّد حسن تھے جو اطمینان اور ہیبت کے ساتھ صحن میں آ رہے تھے۔

سیّد ابوالحسن کی آنکھوں میں رونق آ گئی۔ پلٹے، اپنی نشست گاہ کو مرتب کیا۔ کمرے کے درمیان پڑی کچھ بڑی کتابوں کو ایک طرف رکھا۔ پھر دوبارہ دروازہ کی طرف گئے۔ اچانک ایک عجیب چیز دیکھی۔ ایک ناٹے قد کا آدمی ایک عبا کاندھے پر ڈالے ہوئے اور اپنے چہرہ کو چھپائے ہوئے، ایک درخت کے پیچھے سے سیّد حسن کی طرف دوڑا جو ان کے کمرہ کے نزدیک آ پہنچے تھے۔ سیّد ابوالحسن کا دل دہل گیا۔ دروازہ کے ہینڈل کو پکڑ کر اندر کی طرف کھینچا اور حجرے سے باہر دوڑ پڑے۔

سیّد حسن جو اس پستہ قد آدمی کی آہٹ پا گئے تھے پلٹے۔ وہ آدمی کھڑا ہو گیا اور اپنی ریوالور کو ان کے سامنے کیا۔ سیّد ابوالحسن نے شور مچایا اور کود پڑے، مگر سیّد حسن بہت ہی آرام سے دوسری طرف گھوم گئے پھر ایک زوردار لات اس پستہ قد کے آدمی کے ہاتھ کے نیچے ماری۔ ریوالور ہوا میں بل کھاتا ہوا ایک درخت کے پاس جا گرا۔

مرد پیچھے پیچھے بھاگا اور سر کے بل باغیچہ کے اندر گر پڑا۔ سیّد ابوالحسن ریوالور کی طرف دوڑے اور اسے جھپٹ لیا۔ سیّد حسن جن کی عبا زمین پر گر پڑی تھی فوراً ہی اس مرد کے پاس جا پہنچے۔ مرد کے ہاتھ پاؤں شدّت سے کانپ رہے تھے۔ اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے کہ اچانک گولی کی خوفناک آواز نے مدرسہ کی اوپری منزل کے شیشہ کو ہلا دیا۔ سیّد حسن نے اپنا منھ دوسری منزل کی طرف گھمایا۔ وہ ناٹے قد والا آدمی لومڑی

کی طرح صحن کے ایک جانب بنے حجرہ کی طرف بھاگا۔

سیّد ابوالحسن جو ہکابکا تھے چلّائے۔ سیّد اس طرف آ جاؤ۔ دوبارہ گولی چلی اور سیّد حسن کے قریب کے درخت کے تنے میں پیوست ہوگئی۔ کچھ طلبا صحن میں آ گئے۔ سیّد حسن بڑی پھرتی سے ماہرانہ انداز میں ایک چھوٹے سے درخت کے پیچھے زمین پر لیٹ گئے۔ تیسری گولی کے چھوٹنے کی آواز نے مدرسہ کی فضا کو دہلا دیا۔ طلبا کی چیخ و پکار بلند ہوگئی تھی۔

سیّد ابوالحسن نے اچانک پستہ قد آدمی کو دیکھا کہ مدرسہ سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ وہ اس کی طرف دوڑے اور چلّائے کہ یک آدمی وہاں ہے اسے پکڑو۔ جوان طلبا اس کی طرف دوڑے اور اس کو گھیر لیا۔ مدرسہ کے کچھ پڑوسی دکاندار مدرسہ کے صحن میں آ گئے۔

سیّد حسن نے اطمینان سے زمین سے اپنی عبا اُٹھائی اور بغیر کسی خوف و ہراس کے مدرسہ کے بڑے حوض کے پاس چلے گئے۔

تمام طلبا اطمینان سے سیڑھیوں سے اوپر چلے گئے۔ ایک موٹا شخص جس نے اپنے دوستوں کی طرح اپنے چہرے کو چھپا رکھا تھا، دوسری منزل کے کسی کمرہ سے باہر نکلا اور ہاتھ میں ریوالور لیے ہوئے چھت کی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اس موٹے شخص نے اپنے ریوالور کا اچھی طرح جائزہ لیا، پلٹا اور اس کا رخ نیچے والی منزل کے زینہ کی طرف کر دیا۔ طالب علم چھپ گئے۔ وہ موٹا شخص الٹے پاؤں آہستہ آہستہ وہاں سے دور ہوا اور چھت کی سیڑھیوں تک جا پہنچا۔ کسی نے زینہ کے اس طرف سے آواز لگائی۔ وہ خوف سے مڑا۔ اچانک وہ طالب علم جو کمرہ کے اندر تھا باہر نکل پڑا اور اس کے پیچھے دوڑا۔ پھر پیچھے سے اس کے سر پر وار کیا اور اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ اس موٹے شخص نے خود کو چھڑایا مگر اس کا توازن بگڑ گیا اور زمین پر گر پڑا۔ زینہ کے نیچے چھپے طالب علم باہر نکل آئے اور اس موٹے شخص کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایک آدمی نے اس کے ریوالور کو اُٹھایا۔ طلبا اسے پکڑ کر صحن میں لے آئے۔ پھر وہاں پر جمع لوگ حملہ آوروں کو

سیّد حسن کے پاس لے کر آئے۔ ان کے چہرے سے کپڑا ہٹایا گیا۔ دونوں افراد جوان اور اجنبی تھے۔

سیّد حسن نے بڑے اطمینان سے ان پر نگاہ ڈالی۔ مدرسہ کے طلبا کے ساتھ کافی لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ سیّد ابوالحسن نے دونوں ریوالوروں پر جو ان کے ہاتھ میں تھے ہاتھ پھیرا۔ اور غصہ سے کہا:

''ان کی سزا یہ ہے کہ یہ خود اپنے ہی اسلحہ سے قصاص کیے جائیں''۔

لوگوں نے تکبیر کہی۔ وہ دونوں گھبرا گئے اور رونے دھونے لگے۔ سیّد حسن نے لوگوں کو خاموش کرایا اور کہا:

''میں نے انہیں معاف کر دیا۔ یہ فریب کا شکار ہوئے ہیں''۔

مجمع میں ایک ولولہ پیدا ہوا۔ ایک جوان طالب علم جسے تعجب ہوا تھا سیّد حسن کی طرف منھ کر کے زور سے چلّایا:

''یہ لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے تھے''۔

سیّد حسن نے اپنا ہاتھ اس کے شانہ پر رکھا اور مسکراتے ہوئے کہا:

''انہیں آزاد کر دو۔ یہ ہمارے قاتل نہیں ہیں۔ ابھی مجھے بہت سارا کام ہے اور مجھے اتنی جلدی نہیں مرنا ہے''۔

○○

سونے کا گلوبند

عجیب وغریب خط تھا۔آفس کے لوگوں نے اصل خط کے ترجمہ کو جو اطالوی زبان میں تھا پڑھا اور ان کی آنکھوں میں شوق و خوشی کے آنسو آ گئے۔ پھر سونے کے گلوبند کو بغور دیکھنے لگے۔ جتنا زیادہ اس پر نظریں ڈالتے اتنا زیادہ متعجب ہوتے۔خط ایک اطالوی عورت کی طرف سے آیا تھا اور اس میں امام خمینی کو مخاطب کیا گیا تھا۔خط لکھنے والی نے خط میں کئی جگہوں پر امام خمینیؒ سے اپنے قلبی لگاؤ اور والہانہ عقیدت کا اظہار کیا تھا۔اس عیسائی عورت نے جو معلّمی کے پیشہ سے منسلک تھی خط کے ساتھ سونے کا ایک گلوبند بطور یادگار امام خمینیؒ کے لیے بھیجا تھا۔اس نے اپنے خط میں لکھا تھا:

"یہ گلوبند جو میری شادی کی یادگار ہے اور میں اسے بہت عزیز رکھتی ہوں۔

آپ اور آپ کی تحریک سے اپنے لگاؤ کی نشانی کے طور پر پیش کرتی ہوں"۔

گلوبند کافی وزنی تھا اور اس پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دفتر کے ایک اہلکار نے اس گلوبند کو خط کے ساتھ میز کی دراز میں رکھ دیا تا کہ پہلی فرصت میں امام خمینیؒ کے پاس لے جائے۔

کچھ دن گذر گئے۔امام خمینیؒ چھوٹے سے کمرہ میں بیٹھے تھے اور آفس کے دو لوگوں کے ساتھ آنے والے خطوط کو چیک کر رہے تھے۔ برف خوبصورت سفید چادر کی طرح جماران محلّہ کے اوپر پڑی ہوئی تھی۔آسمان بادلوں سے اور زمین برف باری سے سفید پوش تھی اور ٹھنڈک بہت زیادہ تھی۔

دفتر میں وہ چھوٹی یتیم بچی بے قرار تھی۔اس نے افسردگی سے اپنی نگاہیں اس دروازہ پر ڈالیں جو صحن کی طرف کھلتا تھا۔اسی درمیان رجسٹرار جو ایک مولانا تھے دفتر میں آئے۔بچی کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا:

"بیٹی آؤ، امام خمینیؒ کی ملاقات کو چلیں"۔

بچی کھڑی ہوگئی۔سامنے والے دروازہ پر دوبارہ نگاہ ڈالی۔مگر ابھی بھی غصہ اور افسردگی سے اس کی بھنویں تنی ہوئی تھیں۔رجسٹرار نے اس کے ننھے منے ہاتھ کو پکڑا اور چل پڑا۔بچی اس کے قدم بقدم چلنے لگی۔وہ لوگ آرام سے صحن میں پہنچے۔بچی نے آہستہ سے اپنا پیر جمے ہوئے برف پر رکھا۔تھوڑا آگے بڑھے تھے کہ بچی کچھ سوچ کر کھڑی ہوگئی۔اچانک واپس مڑی اور رونا شروع کر دیا۔رجسٹرار گھبرا گیا۔محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے خاموش کرایا۔

ایک سن رسیدہ شخص امام خمینیؒ کے کمرہ سے باہر نکلا اور کہا:

"امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ اسے جلدی کمرہ کے اندر لے آئیں، وہاں ٹھنڈک ہے"۔

دونوں صحن سے گذر کر امام خمینیؒ کے کمرے میں داخل ہوئے۔رجسٹرار نے سلام کیا۔امام نے اس کے سلام کا جواب دیا اور بچی کو دیکھنے لگے۔لگ رہا تھا کہ اس کے لئے پریشان ہیں۔اس یتیم بچی کے لیے جو شہید کی اولاد تھی۔ اپنے ہاتھوں کو گرمجوشی سے پھیلا دیا۔صحن میں بچی کی سسکیوں نے امام کے دل کو درد سے بھر دیا تھا۔

امام خمینیؒ کے دفتر کے دو لوگ بچی اور امام کو دیکھنے لگے۔ دفتر دار بچی کو قریب لایا۔بچی پہلے تو جھجکی پھر امام اور ان کے چھوٹے سے کمرہ کو حیران نگاہوں سے دیکھا اور انگلی منہ میں دبا لی۔سوچنے لگی۔اسے یقین نہیں ہوا۔کئی مرتبہ البم یا ٹیلی ویژن پر امام خمینیؒ کی تصویر دیکھی تھی۔ماں نے بھی اسے کہہ رکھا تھا کہ امام خمینیؒ اس کے باپ ہیں، مگر اس لمحہ وہ امام کے روبرو کھڑی تھی۔امام کی متناسب داڑھی اسے اچھی لگی۔ابھی اس

کی آنکھیں آنسوؤں سے نم تھیں۔ وہ مسکرائی اور امام خمینیؒ کی گود میں چلی گئی۔

مولانا خوش ہوئے۔ بچی کی ماں نے رجسٹرار کو بتایا تھا کہ بچی کافی دنوں سے گھر میں ضد کر رہی تھی اور اپنے شہید بابا کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور ہنستی بھی نہیں تھی۔ ہمیشہ افسردہ رہتی تھی۔ اسے حضرت امام کی خدمت میں لائی ہوں تا کہ انہیں دیکھ کر اس کی بے چینی دُور ہو جائے۔

امام خمینیؒ نے بچی کو اپنے زانو پر بٹھایا۔ اس کی نم آنکھوں کو پوچھا اور دھیرے دھیرے اپنے رخسار کو اس کے چہرہ سے لگایا اور پھر بے پناہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بچی کی افسردہ نگاہوں میں تھوڑی سی خوشی کی رمق جاگ اُٹھی، اور اس کا غم دھیرے دھیرے دُور ہو گیا۔ بچی ایک چھوٹے سے کبوتر کی مانند تھی، جس نے پرمہر اور چھتے دار درخت میں پناہ لے رکھی ہو۔

آقا نے اپنے بچوں کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ محبت سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور دھیرے سے اس کے کان میں کچھ کہا۔ بچی کا پھول جیسا چہرہ مزید کھل اُٹھا۔ رجسٹرار امام خمینیؒ اور بچی کی باتوں کو نہ سمجھ سکا۔ امام ابھی بھی بچی سے باتیں کر رہے تھے اور اس کے کان میں برابر کچھ کہے جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ بچی کی نازک ابروؤں کے بل ڈھیلے پڑتے گئے اور اس کے ہونٹوں پر ہنسی کا رنگ دوڑنے لگا۔ پھر اس کی پیشانی کی شکن ختم ہو گئی۔ امام خمینیؒ برابر بولے جا رہے تھے یہاں تک کہ بچی ہنس پڑی۔ رجسٹرار بھی مسکرایا۔ امام کو راحت محسوس ہوئی۔ بچی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اپنے ہاتھوں کو امام خمینیؒ کی گردن میں ڈال دیا۔ امام نے ہنستے ہوئے اطمینان کی سانس لی اور اپنی نظریں آسمان کی طرف گھمائیں پھر طاقچہ کی طرف گئے اور اس پر سے کچھ اُٹھایا۔ وہی سونے کا گلوبند تھا۔ وہ گلوبند جسے اطالوی عیسائی عورت نے ہدیہ کیا تھا۔ بچی ان کے اس عمل سے متعجب تھی۔ امام خمینیؒ نے اس گلوبند کی ڈوری اس کے گلے میں ڈال دی۔ بچی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور امام خمینیؒ کے چہرہ کو بوسہ دیا۔ امام نے اسے پھر پیار سے

تھپتھپایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ بچی نے امام خمینیؒ کے لیے اپنا ہاتھ ہلایا، اس کی ایک نظر گلوبند پر اور ایک نظر راستے پر تھی۔ اور رجسٹرار کے ساتھ کمرہ سے باہر نکل گئی۔

○○

اس کتاب کی خاطر

یہ غروب کا وقت کس قدر اسرار و رموز سے پُر ہے۔ آسمان کس قدر خاموش و حیرت انگیز ہے۔ گلیاں پرندوں کی آواز سے خالی۔ آج کی رات ان حسین راتوں میں سے ہے جو تم سے ہم کلام ہونا چاہتی ہے۔ آسمان کی نگاہیں شاید تمہاری طرف برابر لگی ہوئی ہیں اور جگمگاتے ستارے تم سے نظریں نہیں ہٹا رہے ہیں۔ تمہاری ہمت نہیں پڑ رہی ہے کہ کھڑے ہو کر انہیں بغور دیکھو۔ تمہارا دل کچھ کہنا چاہتا ہے اور تمہاری مہربان آنکھیں آنسوؤں کی برسات کرنے لگتی ہیں۔ وہ آنکھیں جو ستاروں کا حسین خواب لگتی ہیں۔ گلیاں تمہارے قدموں کی چاپ کی عادی ہیں اور سنگریزے تمہارے قدموں کے آہنگ کو بخوبی پہچانتے ہیں۔

استاد کی یاد آتی ہے۔ وہ استاد جو علم و ایمان میں تمہارے دیگر اساتذہ کا ہم پلّہ نہیں ہے۔ ایسا استاد جس کی تحریریں اور باتیں موضوع بحث ہیں۔ اس کا ذہن عجیب و غریب فکر کا حامل ہے۔ تم کو کوئی افسوس نہیں ہے کہ تم کو اس کتاب کے لئے اس کا شاگرد بننا پڑا۔ اور دل ہی دل میں نہیں کہو گے کہ میری عمر کے چند دن بیکار و برباد ہو گئے، اے خدا تجھ سے شرمندہ ہوں۔

تمہارا دل خوشی سے لبریز ہے۔ مگر جس وقت تم اپنی ضرورت کے بارے میں سوچتے ہو تمہارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ برابر دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے۔ تمہارا سر بھاری ہو جاتا ہے۔ چاہتے ہو کہ اس کام کو چھوڑ کر پلٹ جاؤ اور اسے

بھول جاؤ۔ لیکن ایک انجانا سا احساس تمہارے وجود میں جان پکڑتا ہے اور تمہارے دل کو ڈھارس دیتا ہے۔ ایک نرم و نازک سی آواز تمہارے کان میں گونجتی ہے۔

''جاؤ... خدا تمہارے ساتھ ہے''۔

اور تم پہلے سے زیادہ لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چل پڑتے ہو۔ پروردگار تیری ہی اُمید کے سہارے جا رہا ہوں۔ جو تیری رضا ہو اس پر شاکر ہوں۔

گلی میں دروازے کی آہنی زنجیر تمہارے کانپتے ہاتھوں سے صدا دیتی ہے۔

''کون ہے''۔

''میں ہوں، آپ کا شاگرد''۔

دروازہ کڑک دار آواز کے ساتھ چوکھٹ پر آدھا گھومتا ہے اور کھل جاتا ہے۔ تمہاری اور استاد کی سلام اور مزاج پرسی کی آواز گلی کے سناٹے میں گونجتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر استاد کی آنکھوں میں بجلی سی چمک پیدا ہوتی ہے اور ان کی نگاہوں کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ تم محبت سے کہتے ہو:

''میری آپ سے ایک گذارش ہے۔ میں آپ کی کتاب کو بطور امانت لینے آیا ہوں۔ وہی کتاب جس کے بارے میں آج بات ہو رہی تھی، اگر آپ مجھے امین سمجھتے ہوں''۔

استاد اپنی انگلی پیشانی پر رکھتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں۔ ان کی تھکی اور بجھی ہوئی آنکھیں پھیل جاتی ہیں۔ تم سوچنے لگتے ہو۔ شاید وہ اپنے دل میں سوچ رہے ہوں:

''کیا کروں کتاب دوں یا نہ دوں؟ میں نہیں چاہتا کہ یہ کتاب کسی کے ہاتھ لگے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں شیعہ علماء کے ہاتھوں میں نہ جا پہنچے۔ اس وقت میرا کام خراب ہو جائے گا۔ میں اپنی عاقبت سے ڈرتا ہوں''۔

تم کچھ بھی نہیں کہتے۔ مگر تمہارا دل خدا کے ذکر سے سرشار ہو اُٹھتا ہے۔ استاد

تمہارے سراپا کا جائزہ لیتے ہیں پھر کہتے ہیں:

''آؤ، اندر آؤ۔ یہاں کھڑے نہیں رہنا چاہیے''۔

تم گھر کے اندر داخل ہوتے ہو۔ ایک لمبے دالان سے ہوتے ہوئے ان کے چھوٹے سے کمرہ میں ایک بڑے سے نرم گاؤ تکیہ پر ٹیک لگاتے ہو۔ تم خود سے کہتے ہو:

''ان کی شاگردی کرنے کا مقصد یہی کتاب تھی۔ اگر ان کی شاگردی نہ کرتا تو نہ ان سے دوستی ہوتی اور نہ میں ان کے گھر آ سکتا تھا تا کہ یہ کتاب میرے ہاتھ لگے۔''

استاد اپنی کتابوں کے انبار میں سے ایک کتاب باہر نکال کر لاتے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے تمہارے قریب رکھتے ہیں۔ مگر شاید وہ شک و تردید میں ہیں۔ بے زاری سے کہتے ہیں:

''میں نے خود سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ اپنے جاننے والوں کو ایک رات سے زیادہ کے لیے یہ کتاب نہ دوں۔ تم چونکہ ایک ممتاز شاگرد ہو اور میری باتوں کو اچھی طرح سمجھتے ہو اور یقین رکھتے ہو، اس لئے صرف آج کی رات پڑھ لو اور کل صبح مجھے واپس لوٹا دو۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن کے ہاتھ لگ جائے''۔

''منظور ہے۔ یقیناً کل صبح اوّل وقت اسے آپ کو لوٹا دوں گا''۔

خوشی خوشی تم اُٹھ کھڑے ہوتے ہو۔ کتاب بغل میں دباتے ہو اور اپنے بوڑھے استاد سے خدا حافظ کہتے ہو۔ راستہ میں کتاب کی اچھی طرح ورق گردانی کرتے ہو:

''یہ وہی کتاب ہے جو استاد منبر پر جا کر لوگوں کو پڑھ کر سناتا ہے اور اپنی تہمت اور جھوٹ سے امام علیؑ اور اہلِ بیتؑ کی توہین کرتا ہے''۔

○

تمہارے آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ تمہارے کمرہ میں جل رہی کم روشنی والی شمع

میں چمکتا ہے اور رخساروں سے نرم داڑھی پر ڈھلکتا ہے۔ تمہیں آرام و قرار نہیں ہے۔ کتاب کے ایک ایک ورق کو اچھی طرح سے دیکھتے ہو اور تمہارے دل کا چشمہ خوشی سے موجزن ہو اُٹھتا ہے۔ آج کی رات جس قدر بھی ممکن ہو اپنے ہاتھوں کو کام میں لاؤ اور کتاب کو نقل کرو۔

آج رات سے صبح تک کا وقت تمہارے پاس ہے۔ کتنا محدود وقت ہے۔ اتنی موٹی کتاب اور اتنی باریک سطریں، کیسے کام ختم ہوگا۔ تم خود کو اطمینان دلاتے ہو کہ خدا نے چاہا تو نقل کا کام پورا ہو جائے گا۔ تمہارے ہونٹ دوبارہ خدا کے شیریں ذکر کے لئے کھلتے ہیں۔ تم پھر دل ہی دل میں خدا سے لو لگاتے ہو کہ تمہارا ہاتھ کام سے نہ رُکے اور تمہاری آنکھیں خستہ نہ ہوں۔ اگر کتاب کی نقل ہو جائے اور مناسب وقت میں اہلِ بیتؑ کی مخالفت میں خود ساختہ جھوٹ اور دشمنی کا جواب دے دیتے ہو تو ایک بڑے کام کو تم نے انجام دیا ہے۔ قلم کو دوات میں ڈبوتے ہو اور دھیرے دھیرے لکھنا شروع کرتے ہو:

''اتنی ساری سطریں اور صفحوں کو کس طرح صبح تک ختم کیا جائے''۔

تم خود بھی نہیں جانتے ہو۔ مگر تمہارے دل میں کسی طرح کا خدشہ نہیں ہے۔

○

رات آدھی گذر چکی ہے کہ ناگاہ تمہارے چہرہ پر ہوا کے جھونکے پڑنے سے تمہاری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ تم چونک جاتے ہو اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہو۔ ناراحتی کے ساتھ بیٹھ جاتے ہو اور کمرہ میں چاروں طرف نظر دوڑاتے ہو۔ بہت جلد تمہاری سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ چند گھنٹے تم سو گئے تھے اور رات تمام ہونے کو ہے۔ تمہارے دل کو دھکا سا لگتا ہے:

''اے خدا! میں نے کتاب کو پورا نہیں کیا اور صبح ہو گئی۔ کیوں ایسا ہوا۔ اب کیا کروں''۔

اچانک دلکش خط میں لکھے ہوئے چند اوراق تمہاری توجہ کو اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔تم انہیں ہاتھ میں لیتے ہو۔بہت سارے ورق جو تمہارے سامنے ہیں ان کو ٹٹولتے ہو:

''یہ تو میری تحریر نہیں ہے۔انہیں تو میں نے نہیں لکھا ہے۔یعنی یہ کیا...خدایا...''

تمہاری سرد پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے۔تم اپنی گردن گھماتے ہو،لگتا ہے کمرے کے در و دیوار سے ایک دلنشیں خوشبو آرہی ہے۔تمہارے دل کا غم نکل کر گلے میں اٹک جاتا ہے۔حیرانی کے عالم میں تم ان اوراق کو دوبارہ بغور دیکھتے ہو۔تم مبہوت ہوجاتے ہو۔تمہاری زبان بند ہوجاتی ہے اور تمہاری آنکھیں اس تحریر کو دیکھ کر خیرہ ہوجاتی ہیں:

''نا...نام...م...مقدس''

تمہاری پریشانی دور ہوجاتی ہے۔تم سجدہ میں گر جاتے ہو۔تمہارے دہاڑیں مار کر رونے کی آواز فضا میں بلند ہوتی ہے۔خدایا یہ کیسی عجیب رات تھی۔میں نے ان کی تشریف آوری کا احساس کیوں نہیں کیا۔میں ان کی زیارت کیوں نہ کرپایا۔

امامِ زمانہؑ کے مبارک ہاتھوں کی لکھی ہوئی تحریر کو سونگھتے ہو اور ایک جگہ رکھتے ہو۔

امام نے کتابت کے آخر میں لکھا ہے:

''کتبہ م ح م د بن الحسن عسکری صاحب الزمانؑ[1]''۔

تمہارا رونا زیادہ ہوجاتا ہے۔امام کے کتابت کردہ ایک ایک ورق کو بڑے شوق سے سونگھتے ہو۔تحریر کے آخر میں امام کی دستخط پر تم دوبارہ نظریں ڈالتے ہو۔تم بے ہوش ہونا چاہتے ہو۔یہاں تک کہ سپیدۂ سحری قریب پہنچتی ہے۔شکستہ دلی سے تم اپنی جگہ سے اُٹھتے ہو اور خود کو نمازِ شب کے لیے آمادہ کرتے ہو۔اس کتاب کو اس کے اصل مالک کے حوالہ کردینی چاہیے۔پھر اطمینان سے اس کتاب کے لکھنے والے یعنی تمہارے استاد

۱۔ اس نسخہ کو م ح م د بن حسن عسکری صاحب الزمان نے لکھا ہے۔

نے جو تہمتیں اور جھوٹ شیعوں کی طرف نسبت دی ہے اس کا ایک ایک کرکے مدلل اور علمی دلیلوں سے جواب دو۔

○○

۱۔ جو شخص کتاب کو نقل کرنے کے لیے گھر میں لاتا ہے وہ بزرگ عالم مرحوم علامہ حلی ہیں جو شیعوں کے دانشمند اور نامور فقہا میں سے ہیں۔وہ ۶۴۸ قمری میں حلہ عراق میں پیدا ہوئے اور ۷۸ سال کی عمر میں اس دُنیا سے رحلت فرمائی۔

عزیز ہم سفر

تم گھر سے باہر نکلتے ہو۔ ہر پنجشنبہ کی طرح ،زیرِ لب دُعا پڑھتے ہوا ور اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہو۔گھوڑا آہستہ آہستہ یکساں طرز کے حلہ[1] کے چھوٹے چھوٹے گھروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ پھر چھوٹی سی نہر کی مانند گلیوں میں رواں ہو جاتا ہے۔ ہر پنجشنبہ کو حلّہ شہر سے رخصت ہو کر شب جمعہ میں کربلا میں حرم امام حسینؑ میں مہمان ہوتے ہو اور جمعہ کے روز ظہر کے بعد حلّہ واپس جاتے ہو۔

ہوا تمہارے لیے کس قدر دلپذیر ہے، کچے راستوں سے گذرتے ہوئے خیالوں میں گم ہو جاتے ہو اور دُنیا کی ہر چیز تمہارے حافظہ سے محو ہو جاتی ہے۔ کربلا کو دیکھنا، امام حسینؑ، حضرت ابوالفضل اور شہدا کے حرم کی زیارت تمہارے لیے کس قدر معنویت رکھتی ہے۔ایک دُنیا کے برابر اس کی قیمت ہے اور کسی بھی چیز کو اس کا بدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

تمہارے دل کی کیفیت بدلی ہوئی ہے۔پچھلے ہفتوں کی طرح نہیں ہو۔ پیچھے سے ایک سوار تم تک پہنچتا ہے۔تم اس خوبصورت آدمی سے تھوڑی دیر تک سلام اور بات چیت کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ تمہارے لیے ایک اچھا ہم سفر ہے۔تم تنہائی سے بھی باہر نکل آؤ گے اور دوسری بات یہ ہے کہ تم اس کی باتوں سے سمجھ گئے ہو کہ پڑھے لکھے شخص سے بات کر رہے ہو۔

راستہ مختصر سے مختصر ہوتا جاتا ہے، مگر تمہاری باتیں ختم ہونے کو نہیں آتی ہیں۔

۱۔ حلّہ: عراق کے ایک شہر کا نام۔

تمہارا اچھا ہم سفر کس قدر دانا ہے، جو کچھ تم اس سے سوال کرتے ہو آسانی سے جواب دیتا ہے۔تم کو حیرت ہوتی ہے۔تم نے اب تک اسے نہیں دیکھا ہے۔یعنی کس شہر میں سکونت پذیر ہے۔تم اچھی طرح سمجھ گئے کہ وہ تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔اسی وقت تم اپنے دل میں سوچتے ہو کہ:

"وہ ہر شے سے واقف ہیں اور میں کچھ نہیں جانتا۔خدایا یہ بزرگوار عالم کون ہیں۔کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ان کا نام کیا ہے اور کہاں جا رہے ہیں"۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے تمہارے علمی نظریہ کے برخلاف ایک حدیث نقل کی۔ ان کا کلام کس قدر مؤثر اور دل میں اُتر جانے والا ہے۔تم ان سے بحث و مباحثہ کرتے ہو۔وہ متانت اور سنجیدگی سے تمہارے لیے اپنی بات کے منابع کا ذکر کرتے ہیں۔

"یہ حدیث تہذیب[1] نامی کتاب کے فلاں صفحہ اور فلاں سطر میں لکھی ہوئی ہے"۔

تم متعجب ہوتے ہو کہ یہ پردیسی شخص تمہاری تہذیب نامی کتاب کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے۔جب کہ وہ کتاب صرف تمہارے پاس ہے اور کسی کو اس کی خبر نہیں ہے۔تمہارے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ یہ دھڑکن تمہارے لیے لذت بخش ہے۔تم رونا چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ان کے ہاتھ پاؤں پر گر پڑو اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دو۔ یہ بے مثال موقع تمہاری زندگی میں آیا ہے۔تم سوچتے ہو کہ یہ شخص بے عدیل علاّمہ ہے۔وقت کو غنیمت شمار کرنا چاہیے۔پس تم اپنی علمی مشکلات کو اس کے سامنے پیش کرتے ہو۔

ایک چھوٹی سی چھڑی جو تمہارے ہاتھوں میں تھی زمین پر گر جاتی ہے۔تم بہت ہی زیادہ ہیجان کے ساتھ اپنے دل کی بات زبان پر لاتے ہو اور پوچھتے ہو:

"کیا غیبتِ کبریٰ کے زمانہ میں امامِ زمانہؑ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

۱۔ کتاب تہذیب: کتاب تہذیب شیخ طوسی کی مشہور فقہی کتاب ہے، جو علامہ حلی (وفات ۷۲۶ ہجری قمری) کے قبضہ و اختیار میں تھی۔

وہ چھڑی کو اُٹھاتے ہیں اور بڑی محبت سے تمہارے حوالہ کرتے ہیں۔تم ان کے لطیف ہاتھوں کی گرمی کو اچھی طرح محسوس کرتے ہو۔وہ جواب دیتے ہیں:

''کیسے امام زمانہ کو نہیں دیکھا جا سکتا جب کہ اس وقت ان کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہے''۔

تمہارا پورا وجود خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے۔تم اڑنا چاہتے ہو۔تمہارے پورے وجود کو آتشِ شوق نے جلا دیا ہے۔بڑی تیزی سے تم گھوڑے سے اُترتے ہو اور خود کو ان کے قدموں پر گرا دیتے ہو اور رونے لگتے ہو۔اتنا گریہ کرتے ہو کہ اب تک اتنا نہیں روئے ہو۔امام کو سونگھتے ہو اور ان کی بہشتی خوشبو سے لطف اندوز ہوتے ہو اور اچانک بے ہوش ہو جاتے ہو۔

جب تمہارے حواس بجا ہوتے ہیں تو امام تمہارے پاس نہیں ہیں۔تم اکیلے رہ گئے ہو۔تمہارا دل بیٹھ جاتا ہے۔امامِ زمانؑ کے دیدار کی شیرینی تمہارے دل میں باقی ہے۔تم دوبارہ گریہ کرنے لگتے ہو، اور پھر سے ان کے محبت بھرے چہرے کی یاد آتی ہے۔

○

تم اپنے کتب خانہ میں کتاب تہذیب کو بڑی تیزی سے کھولتے ہو اور اس کے صفحات میں سے ایک صفحہ پر وہی حدیث امام کی بتائی ہوئی نشانی و علامت کے ساتھ تمہاری نظروں کے سامنے جلوہ بکھیرتی نظر آتی ہے۔تم کانپتے ہاتھوں سے ایک قلم اپنے ہاتھوں میں سنبھالتے ہو اور اس صفحہ کے حاشیہ پر لکھتے ہو:

''یہ وہ حدیث ہے جس کی خبر میرے مولا امامِ زمانہؑ نے مجھے دی ہے[1]''۔

○○

۱۔ اس قصے کا اصل منبع کتاب دارالسلام عراق میں صفحہ ۷ پر مذکور ہے۔

فوجی جوان ہمارے گھر کے مہمان ہیں

جب پانی تانبے کے جگ کی پتلی گردن سے اوپر کی سمت آیا تو رک گیا۔عمو کمیل نے برف کے ٹکڑوں کو اچھی طرح دھویا اور جگ میں ڈال دیا۔لمبی سانس لی۔کمر سیدھی کی اور ''یا حسینؑ'' کہا۔ان کی آنکھیں تعجب سے پھٹی ہوئی تھیں۔گھبرائے ہوئے تھے کہ دیکھیں کیا ہونے والا ہے۔چاہتے تھے کہ جناب سیّد محمد باقر[1] کا گھر آزاد ہو، اور پھر مریدوں اور طلباء کی بھیڑ یہاں جمع ہو۔یقیناً ان کا کام بڑھ جائے گا پھر انہیں اپنے بھتیجے اُسامہ سے مدد لینی پڑے گی۔بہرکیف، جو کچھ بھی تھا غنیمت تھا۔اور ایک دنیا کے برابر اس کی قیمت تھی۔آزادی اہم اور عزیز تھی اور وہ بھی بعثی حکومت کے مرکز اطلاعات و سازمانِ امنیت کے بے دین جلادوں کے ہاتھوں سے آزادی۔شاید کوئی خوشگوار واقعہ رونما ہونے والا ہے۔شاید جناب سیّد محمد باقر کو ہمیشہ کے لیے آزاد چھوڑ دینا چاہتے ہوں تا کہ درس و بحث اور زندگی میں مشغول ہوں۔مگر جناب سیّد محمد باقر کو کوئی پروانہ تھی۔

عمو کمیل کی عمر بڑھاپے کی ڈھلان پر تھی، مگر ابھی بھی ان کے بازوؤں کی طاقت

۱۔ سیّد محمد باقر: علامہ آیۃ اللہ العظمیٰ شہید سیّد محمد باقر صدر صدام کی ڈکٹیٹرشپ کے زمانہ میں ایک بزرگ عالم اور مدبر تھے۔۱۳۵۳قمری کاظمین عراق میں پیدا ہوئے۔حوزہ میں ایک بزرگ استاد اور معروف ہستی کے عنوان سے جانے پہچانے گئے وہ حکومت سے لوہا لینے میں پیش پیش تھے۔ان کی اہم تصنیف کردہ کتابیں یادگار کے طور پر موجود ہیں۔آخرکار وہ اور ان کی بہن بنت الہدیٰ صدر بے انتہا مصائب اور اذیت میں گرفتار قید خانہ میں ۱۹/فروردین ۱۳۵۹قمری کو شہید کر دیئے گئے۔

رو بہ عمل تھی۔ چہرہ سفید اور پھولا ہوا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔ وہ سیّد محمد باقر کے گھر کے خادم تھے۔ لیکن سیّد محمد باقر اپنے باپ کی طرح ان کا احترام کرتے تھے اور ان کے ساتھ اپنے ان خاص شاگردوں سے بھی اچھا برتاؤ کرتے تھے جنہیں ان کے گھر میں جانے کی اجازت تھی۔

عمو کمیل نے جگ کو اُٹھایا۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور کمرہ کی طرف چل پڑے۔ ان کا سینہ پھنک رہا تھا اور انہیں تکلیف دے رہا تھا، مگر وہ اس پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ وہ راہداری سے آگے بڑھے۔ سیّد محمد باقر کے کمرہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ جگ کو زمین پر رکھا اور تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھری۔ اگر وہ اس طرح بار بار سانس نہیں لیتے تو فوراً ہی رنگ متغیر ہو جاتا اور سانس پھولنے لگتی۔

کمرے کے جالی دار پردہ کے پیچھے سے ان کی نگاہ صحن میں گئی۔ دوبارہ ان کے دل میں ایک آگ سی لگ گئی۔ حکومت کے فوجی صحن کے دروازہ اور دیوار پر ایک ایک کر کے پیڑ کی طرح تنے کھڑے ہوئے کمرے کی طرف نگاہیں لگائے ہوئے تھے۔ انہیں غصہ آیا۔ انہوں نے ایک سپاہی کو دیکھا جس نے آستین سے اپنے کانوں کے اردگرد سے پسینہ پوچھا اور غضبناک نگاہوں سے جناب سیّد محمد باقر کے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ عمو کمیل کو برا لگا، اپنے خون ہوئے دل کی گہرائی سے کہا کہ اس گرمی کے موسم میں یہی تمہارا صلہ ہے۔ تم نے خود ایسا چاہا ہے۔

اس کا دل جناب سیّد محمد باقر کے لیے بہت رنجیدہ ہوا۔ نو مہینہ سے ان کا گھر محاصرہ میں ہے۔ کچھ نزدیکی عزیز اور خاص شاگردوں کے علاوہ کوئی بھی وہاں نہیں آ سکتا تھا۔ عمو کمیل کو جب غصہ آتا تو کہتے:

''آقا سیّد محمد باقر کے لیے یہ گھر ہارون کے زندان کی طرح ہو گیا ہے''۔

آنسو کے چند قطرے ان کے جھریوں دار چہرہ پر ڈھلک پڑے۔ عمو کمیل کو ہارون رشید کے زندان کی یاد آئی تو بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔

''اے موسیٰ ابن جعفرؑ! میری جان آپ پر قربان، زندانِ ہارون کہاں اور یہاں کہاں!''

اپنے تر چہرے کو پشت دست سے صاف کیا، پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ کمرے کے اندر سے ایک مہربان آواز آئی:

''عمو کمیل آ جاؤ''۔

سیّد محمد باقر ان کی دستک کو پہچانتے تھے۔ عمو کمیل نے جگ کو اُٹھایا۔ دروازہ کے ہینڈل کو جلدی سے گھمایا، دروازہ کھلا اور عود کی اچھی خوشبو کمرہ کی فضا سے باہر نکلی۔ عمو کمیل نے ایک لمبی سانس لی اور خوش دلی سے قریب گئے۔ شیخ محمد رضا بھی وہیں تھے۔ ان کے سلام کرنے سے پہلے آقا سلام میں سبقت لے گئے اور کہا:

''چچا تم نے دوبارہ دستک دی۔ تم میرے محرم ہو''۔

عمو کمیل کے دل کا غم پہلے کے مقابلہ زیادہ ہو گیا۔ ان کے دل میں دوبارہ ایک تمنا جاگی کہ ضریحِ مولا علیؑ کے پاس جائے اور رونا شروع کر دے۔ مگر سیّد محمد باقر نہیں جانا چاہتے تھے۔ سیّد محمد باقر بھی اگر آتے تو زیارت میں زیادہ مزہ آتا۔ اس وقت یقیناً صاحب عزیز ضریح ایک دوسری ہی نظر ان پر ڈالتے۔

سیّد محمد باقر نے محبت سے عمو کمیل کے ہاتھوں سے جگ لیا اور کہا:

''تم اس تانبے کے جگ کو کیوں اُٹھا کر لائے۔ یہ بھاری ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہارا سینہ درد نہ کرنے لگے''۔

عمو کمیل نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا:

''میں نے سوچا کہ شاید کوئی واقعہ رونما ہونے والا ہے اور مہمان زیادہ تعداد میں آئیں گے، اسی لیے تانبے کے بڑے جگ کو اُٹھا لایا ہوں''۔

سیّد محمد باقر مسکرائے۔ ان کے دوست شیخ محمد رضا نے انہیں غور سے دیکھا، مگر کچھ کہا نہیں۔ سیّد محمد باقر نے کہا:

''ہاں یہ ٹھنڈا پانی میرے ہمیشہ کے اور پرانے مہمانوں کے لیے ہے''۔

شیخ محمد رضا[1] آقا کی گفتگو کے بیچ میں بول پڑے اور بہت ہی ناراحتی سے کہا:

''مگر جناب وہ لوگ آپ کی حرمت کو ضائع کر رہے ہیں''۔

سیّد محمد باقر کی پرمعنی نگاہوں نے شیخ محمد رضا کے ہونٹوں کو سل دیا۔

عموکمیل ان دونوں کو تعجب سے دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں، یعنی وہ کون سے ہمیشہ والے قدیمی مہمان ہیں جنہوں نے سیّد محمد باقر کی حرمت کو ضائع کیا ہے۔

سیّد محمد باقر نے اپنے پرمحبت ہاتھوں کو عموکمیل کے شانوں پر رکھا اور ہمیشہ سے زیادہ پرسوز انداز میں کہا:

''مجھے معاف کردو۔ یہ جگ تمہارے لیے بہت بھاری ہے عمو''۔

عموکمیل میں کچھ کہنے کی طاقت نہ رہی۔ شیخ محمد رضا نے بند کمرہ کی کھڑکی کے پردہ کو ایک طرف سرکایا۔ دردبھری ایک آہ کھینچی اور اچھی طرح صحن میں نگاہ دوڑائی۔ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے آہستہ سے کہا:

''آقا، اس ستمگر جماعت نے کئی مہینوں سے بڑی بے رحمی سے آپ کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ یہ لوگ یزیدی فوج کی طرح ہیں''۔

عموکمیل کی پیشانی کی شکنیں تعجب سے اُبھر آئیں۔ سیّد محمد باقر نے جگ کو اس کے ہاتھ میں تھمایا اور کہا:

''اس پانی کو ان کے پاس لے جاؤ اور انہیں اچھی طرح سیراب کردو۔ اس چلچلاتی دھوپ میں پیاسے ہیں۔ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم ان کی مدد نہ کریں۔ تمام فوجی میرے گھر کے مہمان ہیں''۔

عموکمیل کے ہاتھ کانپنے لگے۔ عنقریب تھا کہ جگ ان کے ہاتھوں سے زمین پر

۱۔ شیخ محمد رضا: شیخ محمد رضا نعمانی، علامہ شہید سیّد محمد باقر صدر کے قریبی اور عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔

گر پڑے۔ یہ کیا؟ آقا نے پانی اپنے دشمنوں کے لیے منگایا ہے؟ ان بعثی لوگوں کے لیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بچوں اور عورتوں تک پر رحم نہیں کرتے۔

سیّد محمد باقر کی مہرآمیز نگاہ منتظر تھی کہ وہ جلد صحن میں جائیں مگر ایسا لگتا تھا کہ عموکمیل کے پیروں میں چلنے کی طاقت ہی نہیں اور انکار بھی نہیں کرسکتے تھے۔ یقیناً اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ تھی اس لیے چل پڑے۔ اسی وقت آقا سیّد محمد باقر نے شیخ محمد رضا سے کہا:

''یہ فوجی ہیں، ان کا انحراف فوجی کیمپ کے سبب ہے یا ان کے خانوادہ کی نامناسب تربیت کا نتیجہ ہے، ورنہ یہ بھی اہلِ ایمان ہیں۔ دیکھو یہ لوگ کس قدر تنہا ہیں یہاں تک کہ ان کے افسروں میں سے کوئی بھی یہاں نہیں ہے''۔

شیخ محمد رضا کے ہونٹوں پر گویا مہرِ سکوت لگ گئی تھی۔ ایک لفظ بھی منھ سے نہیں نکالا اور کچھ بھی نہیں کہا۔ عموکمیل آہستہ سے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ الماری سے کچھ گلاس اُٹھایا اور صحن میں آیا۔ گرمی کے موسم کی جلا دینے والی تپش اس کے جسم کو محسوس ہوئی اور ان کا چہرہ بھن گیا۔ فوجی اسے دیکھتے ہی تن کر کھڑے ہوگئے۔ وہ پہلے فوجی کے پاس گئے۔ فوجی کو ایک جھٹکا لگا۔ عموکمیل کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر بڑی کراہت سے ایک گلاس میں پانی اُنڈیلا اور فوجی کی طرف بڑھایا۔

فوجی اپنی حیرت زدہ آنکھوں کے ساتھ پلٹا اور سیّد محمد باقر کے کمرہ کی کھڑکی کی طرف نظر دوڑائی، پھر بہت ہی محتاط نظروں سے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا اور گلاس کو ہاتھ میں لے لیا اور بڑی بے تابی سے اسے پی گیا۔ ٹھنڈے پانی نے اس کی جان میں جان ڈال دی اور اسے طاقت بخشی۔ عموکمیل نے دوبارہ اس کے لیے پانی اُنڈیلا۔ پھر دوسرے فوجیوں کی طرف گئے۔ ان میں سے ایک نے زیرلب ''یاحسینؑ'' کہا اور پانی پیا۔ کچھ فوجی عموکمیل کے اِردگرد کھڑے ہوگئے۔ عموکمیل نے کہا کہ یہ عملِ خیر سیّد محمد باقر کی جانب سے ہے۔ تمہاری تھکن اور پیاس کے سبب وہ بہت ہی رنجیدہ تھے۔

فوجیوں نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرائے۔مگر ہر شخص دوسرے کے خوف کی وجہ سے ایک دوسرے سے بات کرنے اور شکریہ ادا کرنے کی ہمت نہ کرسکا۔عمو کمیل واپس ہوئے اور سیّد محمد باقر کے کمرہ کی کھڑکی کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔شیخ محمد رضا کو دیکھا کہ حیرت سے اپنا چہرہ کھڑکی پر چپکائے ہوئے تھے۔

○

اس واقعہ کے چند ہفتہ بعد ایک دن صبح سویرے شیخ محمد رضا گھبرائے ہوئے سیّد محمد باقر کے گھر آئے۔بعثی سپاہیوں کے حصار سے گذرتے ہوئے سیّد محمد باقر کے حضور آئے اور ہانپتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے کہا:

''جناب وہ فوجی جوان۔وہ کچھ فوجی ...''

سید محمد باقر کا روشن چہرہ سوالی ہوا۔

''وہ فوجی، کیا ہوا میرے بیٹے؟''

شیخ محمد رضا نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھا۔تھوک کو بڑی مشکل سے گھونٹا۔آقا سیّد محمد باقر کی طرف منھ کر کے کہا:

''جس روز عمو کمیل نے ان فوجیوں کو پانی پلایا تھا اسی دن سے شیعیت کی طرف ان کا شوق اور میلان شدید ہوگیا۔کچھ دنوں بعد ان کا بعثی گروپ سے کوئی معاملہ اُلجھ گیا اور گروپ کے لیڈروں سے لڑائی ہوگئی اور وہ لوگ فوراً قید کر لیے گئے''۔

شیخ محمد رضا رونے لگے۔آقا سیّد محمد باقر کا رنگ متغیر ہوگیا۔

آج میں نے سنا کہ ان میں سے کچھ فوجی موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے ہیں اور وہ شہادت کے درجہ پر فائز ہوگئے ہیں۔

سیّد محمد باقر بے چین ہوگئے۔کھڑے ہونے کی طاقت نہ رہی۔ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔پھر غم اور پریشانی کے عالم میں کہا:

''بیٹا، تم نے دیکھا۔ان فوجیوں کا دل خدا اور دین کی طرف تھا۔مگر انہیں منحرف کر دیا گیا تھا۔اے میرے خدا...''

سیّد محمد باقر آہستہ آہستہ روتے رہے۔شیخ محمد رضا میں طاقت نہ تھی، روتے ہوئے کمرہ سے باہر چلے گئے۔اچانک عمو کمیل ان کے قریب گئے اور بہت ہی بے چینی سے پوچھا:

''کیا ہوا ہے؟ کیا بات ہوگئی ہے شیخ محمد رضا؟''

○○

بیٹا میرے ساتھ ساتھ پڑھو

میں نے سن رکھا تھا کہ شیعہ اپنے پیغمبرؐ کی اولاد کو سیّد کے نام سے خطاب کرتے ہیں اور خاص طور سے اگر وہ سیّد دانش مند اور بلند مرتبہ ہو تو اپنے دل و جان کو اس کے قدموں پر نثار کرتے ہیں۔ جناب سیّد مرتضیٰ[۱] اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی بغداد شہر کے بزرگ اور دانشمند سادات میں سے تھے۔

میں بغداد میں رہ رہا تھا۔ میرے تعلقات مسلمانوں خاص طور سے شیعوں سے زیادہ تھے۔ آقا سیّد مرتضیٰ کو راستے اور شہر کے میدان میں کئی بار دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ جب میری نگاہیں ان کی نگاہ سے دوچار ہوئی تھیں تو میرے پورے وجود میں ایک بجلی سی دوڑ گئی تھی اور میرے پیروں میں کپکپی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ وہی بزرگ سیّد تھے کہ جب شیعہ ان کے پاس جاتے تھے تو بے پناہ احترام کے سبب ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے تھے یہاں تک کہ کچھ لوگ ان کے پیروں پر گر جاتے تھے۔ بقیہ مسلمانوں کا بھی یہی طریقہ تھا۔ شروع میں تو میں ان کے اس عمل کا مذاق اُڑایا کرتا تھا، مگر ایک بار ان کی مسکراہٹ کی گرمی اُڑ کر میرے دل میں جا بیٹھی تو میں نے خود پر نفرین کی کہ مجھے پیٹھ پیچھے بدگوئی نہیں کرنی چاہیے۔ جو کچھ بھی تھا وہ ایک معقول انسان تھے اور نور ان کے

۱۔ سیّد مرتضیٰ: علامہ سیّد مرتضیٰ شیعوں کی ایک بزرگ ہستی۔ رجب کے مہینہ میں سنہ ۳۵۵ قمری بغداد میں پیدا ہوئے۔ بہت سے علوم میں ماہر تھے اور اہم کتابیں لکھیں۔ ۴۳۶ قمری ۲۵/ربیع الاوّل کو دُنیا سے رحلت فرمائی۔ ان کے جنازہ کو کربلا منتقل کیا گیا اور حرم امام حسینؑ میں دفن ہوئے۔

چہرہ سے ٹپکتا تھا۔ معلوم تھا کہ خدا کے بہترین اور خاص بندے ہیں۔ اگرچہ وہ اور میں اپنے دین میں ہم فکر نہ تھے۔

اس ملاقات کے بعد ایک بار جب وہ اکیلے مرکزی محلّہ سے دھیرے دھیرے جارہے تھے تو میں نے ان کا پیچھا کیا۔ یہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اگر میرے دوست مجھے دیکھ لیتے اور میرے ارادے سے مطلع ہوجاتے تو یقیناً وہ میری سرزنش کرتے اور بات ملامت و تنبیہ تک پہونچتی۔

بہرحال میں احتیاط سے ان کے پیچھے چلتا رہا۔ میری حالت غیر ہوچکی تھی جو بیان کرنے کے لائق نہ تھی۔ وہ لمبا چوڑا ڈیل ڈول، پشت سر سے ان کا سیاہ عمامہ مجھے خواب سا نظر آرہا تھا۔ میں نے خود سے کہا:

"لوگ کہتے ہیں کہ وہ بغداد میں مسلمانوں کے ایک بزرگ دانشور ہیں۔ تو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کیسے راستہ طے کرتے ہیں اور کس طرح لوگوں سے ملتے ہیں اور کدھر جارہے ہیں"۔

لیکن بیچ راستے میں اس ہیبت اور نورانی وضع قطع کو دیکھ کر میرے دل میں ایک طرح کی تشویش پیدا ہوئی جس نے مجھے اپنی جگہ پر روک دیا۔ میں نے خود سے کہا:

"ممکن ہے وہ پلٹ جائیں اور اچانک انہیں روشن اور پراثر نگاہوں سے دیکھیں اور مجھے پہچان لیں اور شک کریں اور میری طرف آئیں"۔

اسی خیال سے میں ایک گھر کی کچی دیوار کی آڑ میں ہوگیا اور جلدی سے اپنے محلّہ کی طرف لوٹ گیا۔ وہ اسی وقار اور اطمینان سے چلتے رہے اور آگے بڑھ گئے۔

بغداد میں میرا کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا۔ لکھنا پڑھنا بھی مجھے نہیں آتا تھا۔ کبھی باغبانی کے لیے نخلستان میں چلا جاتا۔ کبھی کپڑے اور خرمہ وغیرہ جیسی چیزیں بیچتا، اور کبھی بیکار بیٹھا رہتا۔ مگر میں جس کام میں بھی مشغول رہتا اگر انہیں دیکھ لیتا تو میرا ہاتھ کام سے رُک جاتا اور میری نگاہ پرندہ کی طرح ان کی طرف اُٹھ جاتی۔

ایک بار میں نے خود سے کہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے دین سے دور ہو جاؤں۔ ایسا تو نہیں کہ میں منحرف و سست انسان ہو گیا ہوں۔ اگر میرے دوست اس حال سے واقف ہو جائیں۔ اگر... لیکن.... میرے اختیار میں نہ تھا۔ میری حالت کچھ کچھ بدل گئی تھی۔ میری بیوی برابر میرے چہرہ پر مُردنی دیکھ رہی تھی۔ وہ میرے کاموں سے رنجیدہ تھی۔ اور میں... مجھے نہیں معلوم۔ میں کیونکر بتاؤں کہ میری کیا کیفیت تھی۔

یہاں تک کہ اس سخت حادثہ نے یعنی قحط اور خشک سالی نے آباد بغداد کے حال و احوال کو درہم و برہم کر دیا۔ گرمی کی شدت اور پانی کی کمی کے سبب کھجور کے درختوں میں پھل کم لگے۔ کھیتی باڑی کی زمینیں خشک ہو گئیں۔ چشموں کا غلغلہ ناپید ہو گیا۔ بھوک نے لوگوں کے چہرہ کی رنگت چھین لی۔

اگر کوئی شخص میری طرح بیکار تھا تو اسے ایک لقمہ روٹی کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈالنا پڑتی۔ کتنے سخت دن تھے۔ بغداد میں مجھے کام نہیں مل رہا تھا۔ جہاں کہیں بھی گیا مجھے کام نہیں ملا۔ کھجور کے درختوں پر پھل بھی اتنے نہیں لگے تھے کہ مزدور کی ضرورت پڑے۔ کھیتوں میں بھی فصل نہیں تھی کہ لوگ اسے کاٹیں۔ شہر میں بھی پیشہ ورانہ کاموں کا بازار ٹھنڈا اور بے رونق تھا۔ ہر طرف کساد بازاری تھی۔ میں خالی ہاتھوں اور مایوس آنکھیں لیے ہوئے محلّہ محلّہ آوارہ و سرگرداں پھرتا رہا۔

میری بیوی کی آنکھیں افسردہ تھیں۔ میرے بے گناہ چھوٹے چھوٹے بچے پژمردہ ہو گئے تھے۔ تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان جو گھر میں تھا وہ بچوں کے لیے تھا اور ہم لوگ زیادہ تر بھوک کی تکلیف برداشت کرتے، لیکن یہ بھوک اس قدر شدید تھی کہ دھیرے دھیرے ہم کو کمزور کیے دے رہی تھی۔

ایک روز دوبارہ بغداد کے شیعوں کے اسی بزرگ آقا کو سر جھکائے ہوئے دیکھا۔ ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ سفید قبا اور ان کا بڑا سا سیاہ عمامہ میرے ذہن میں اچھا تصور پیدا کر رہا تھا۔ ہرے رنگ کی شال کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی جو پرنوازش

آنکھوں کی ہیبت کو دوچند کر رہی تھی۔ متناسب لمبا سا قد، پیشانی ایسی زیبا کہ اس جیسی پورے بغداد میں نہیں دیکھی تھی۔ خوبصورت صفات کی مکمل شبیہ جسے میں نے اپنے بزرگ پیغمبر حضرت موسیٰؑ کے بارے میں سن رکھی تھی۔ یقیناً یہ خدا کی مرضی تھی کہ صبح کو بہت جلد گھر سے نکل آیا تھا اور میری نگاہ ان پر پڑ گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں ان کے پیچھے کھنچا چلا گیا۔

ان کے چلنے کا انداز اسی روز کی طرح تھا۔ نرم، مضبوط اور پُراحساس بادلوں کی طرح۔ سر جھکائے ہوئے تھے اور زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ میرے دل میں خیال آیا:

''ان کے پیچھے پیچھے چلوں اور کسی تنہا جگہ پر ان کے قریب جاؤں اور بغداد کے قحط کے بارے میں اس سے بات کروں''۔

جو کچھ بھی تھا، شہر کے نامور عالموں میں سے تھے اور یقیناً ان کے پاس وسائل بھی زیادہ ہوں گے۔ اگرچہ ان کی وضع و قطع عام آدمی کی طرح سادہ تھی۔ میرا جبڑا بند ہو گیا اور دل بیٹھ گیا۔ اس خیال کو دل سے نکالا اور خود کو سرزنش کی۔ میں نے سوچا:

''ان کے پیچھے جاتا ہوں۔ شاید صبح اتنی جلدی درس کے لیے کہیں جا رہے ہوں اور ان کا کوئی محل اجتماع ہو تو یقیناً یہ اپنے شاگردوں پر لطف و کرم بھی کریں گے''۔

میں اس خیال سے سراپا شاد ہوا۔ ان کے پیچھے دوڑا۔ ان کے قریب پہونچ کر سایہ کی طرح ان کا پیچھا کیا۔ ایک دو آدمی میری بغل سے گذرے۔ شیعوں کے محلّہ میں میں پہچانا نہ جاؤں اس لیے میں نے اپنے سر اور چہرہ کو اپنی شال سے چھپا لیا۔ نسیم کی اچھی اور عمدہ خوشبو کا جھونکا سامنے سے آ لگا۔ یہاں تک کہ ایک مسجد کے سامنے رکے اور بہت اطمینان سے مسجد میں داخل ہوئے۔ مسجد میں جانے سے میں ڈرا کیونکہ میں جانتا تھا کہ غیر مسلم مسجد میں نہیں جاتے ہیں۔ میں حیران و سرگرداں تھا لیکن شاید کسی نے میرے دل میں کہا کہ چلا جاؤں۔ خود کو اچھی طرح سے چھپایا اور مسجد میں داخل ہو گیا۔

مسجد وسیع وعریض تھی۔ دیواریں بلند تھیں اور ہرے رنگ کے کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ مسجد میں کافی آدمی تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ درس کی جگہ تھی۔ لوگ ان کو دیکھ کر کھڑے ہوئے۔ سلام کیا اور احترام کا مظاہرہ کیا اور تمام لوگوں نے ان کا حلقہ کرلیا۔ میں بھی تمام شاگردوں کے آخر میں ایک کوشہ میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا۔ پہلے خدا کا نام لیا پھر اس روز کے درس پر گفتگو شروع کی۔ میں نے فقط اتنا جانا کہ درس ستاروں سے متعلق تھا۔ ایک ایک جملہ شیریں انداز میں ادا کررہے تھے۔ اگرچہ زیادہ تر باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں مگر میرے دل پر نقش ہوگئیں۔ انہوں نے عجیب اور نئی چیزیں بتائیں۔

میرا وجود خوشیوں سے لبریز ہوگیا تھا۔ ان کے کچھ شاگردوں نے جو میرے سامنے تھے کئی بار مڑکر احتیاط سے مجھے دیکھا۔ میں بھی اس خیال سے کہ کوئی کچھ نہ جانے اپنا سر جھکائے ہوئے تھا۔ ان کا کلام سننے میں محو تھا کہ دفعتاً میں نے دیکھا کہ سب لوگ کھڑے ہوگئے۔ شاید درس ختم ہوگیا تھا۔ میں نے اپنی نظریں ان کی طرف اُٹھائیں۔ وہ دروازہ سے نکلے اور گلی میں چلے گئے۔

میں حیران و پریشان ان کے شاگردوں کی صف سے ہوتا ہوا مسجد کے باہر دوڑا۔ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ چلے جارہے تھے۔ میں کھڑا ہوگیا اور سوچنے لگا عجیب حادثہ تھا۔ خواب کی طرح تھا۔ ان کے اس روز کے درس نے میری فکر کو درہم برہم کررکھا تھا۔ میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ شاید میرے دل کو رنج وغم کے بجائے کوئی شئ پرندے کے پر کی طرح گدگدا رہی تھی۔ دو جوان شاگرد جنہوں نے سر پر عمامہ پہن رکھا تھا اور ان کی بغل میں کتابیں تھیں، مسجد سے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک چلا گیا اور دوسرا وہاں کھڑا رہا۔ میں بے اختیار اس کی طرف مڑا اور میری زبان سے نکلا:

''جناب!''

وہ میری طرف مڑا۔ میرے قریب آیا اور تعجب سے میرے ڈھکے ہوئے سر اور

چہرہ کو دیکھنے لگا۔ پھر بہت ہی خوش روئی سے پوچھا:

''جی، کیا آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟''

میں سوچنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ جوان آدمی نے اپنی سوالیہ نگاہوں سے میرے سراپا کا جائزہ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ شک وشبہ میں مبتلا ہو اس لئے فوراً ہی پوچھا:

''استاد آج کل کیا پڑھا رہے ہیں؟''

اس نے دوبارہ احتیاط سے میری طرف دیکھا۔ میں نے فوراً ہی شال کو اپنے سر اور چہرہ سے ہٹادیا اور ہنس پڑا تاکہ وہ اور زیادہ مشکوک نہ ہو اور میرے لیے دردِسر پیدا نہ ہو۔ وہ مسکرایا اور کہا:

''آج کل استاد جناب سیّد مرتضیٰ کی بحث ستاروں کے بارے میں ہے''۔

میں نے دوبارہ اٹک اٹک کر اور تھکا ہوا سے پوچھا:

''اور وظیفہ... یعنی شاگردوں پر لطف وعنایت...''

اس نے بغیر کسی توقف کے کہا:

''اے... استاد کے پاس خزانہ نہیں ہے۔ ہاں اپنی امکانی حد تک اس قحط اور تنگدستی کے زمانہ میں طلباء کی امداد کے لئے وظیفے کی ایک رقم مقرر کر رکھی ہے''۔

ناگہاں میرے تمام جسم سے خستگی و ملال جاتا رہا۔ ایک خوشی بھری ہنسی سے میرے ہونٹ کھل گئے۔ اس نے اسی حیرانگی مگر بڑی مہربانی سے اپنی نظریں موڑیں اور چلا گیا۔ مسجد کے پاس دوسرا اور کوئی نہیں تھا۔ میں تھا، تنہائی تھی اور ولولہ انگیز نسیم۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو ملا اور خود سے کہا:

''عجیب اتفاق ہے۔ میرے لیے کام نکل آیا۔ کل سے آقا کے درس میں آؤں گا اور ان کا شاگرد ہوجاؤں گا، پھر تو وہ یقیناً مجھے بھی وظیفہ دیں گے''۔

شوق کے سبب میں اپنے دونوں ہاتھ پر پرواز کی طرح پھیلائے ہوئے اپنے محلّہ کی طرف چل پڑا۔ چند قدم چلا تھا کہ اچانک میرا یہ ذوق اور خوشی کافور ہوگئی۔ اگر وہ یہ جان جائیں کہ میں یہودی ہوں، پھر کیا ہوگا؟ اس وقت ان کے جوان شاگرد میری جان کو آجائیں گے۔

میرا سر چکرا گیا اور آسمان میرے سر کے اوپر ایک بڑی چرخی کی طرح گھومنے لگا۔ میرا جسم ایک کچی دیوار سے جاٹکرایا۔ سر کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ میرا نیا نشانہ خطا کر چکا تھا۔ عاجز تھا کہ کیا کروں اور کون سا ارادہ کروں۔ میرے بچوں کے رونے پیٹنے کی آواز میرے کانوں میں گونج اُٹھی جس نے مجھے رنجیدہ کر دیا۔ دیوار کا سہارا لیا۔ گہرے رنج و ملال کے ساتھ جو کھنکھجورے کی طرح میری گردن میں چپکا ہوا تھا۔ غمگین اور خالی ہاتھ اپنے گھر کی راہ لی۔

○

اگلی صبح تک گویا ایک سال کا عرصہ مجھ پر گذر گیا۔ فکر و پریشانی اور تردّد سے بھرا ہوا ایک سال۔ صبح ہونے کو تھی کہ چند ثانیہ کے لیے خواب میں آقا سیّد مرتضٰی کو دیکھا۔ ان کی صاف و شفاف پرنور آنکھوں نے میری رگ و پے میں ایک عجیب نور بھر دیا پھر نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ جب خواب سے جاگا تو میرا پورا جسم پسینہ پسینہ تھا۔ میرے ہونٹ ہل رہے تھے اور میری زبان پر مستقل جاری تھا:

''سیّد آقا... آقا سیّد...''

کچھ دیر بعد مجھے افاقہ ہوا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں دوبارہ ان کے درس میں جاؤں اور اس بار خود کو ان کے ایک شاگرد کی حیثیت سے متعارف کراؤں۔ اگر وہ سمجھ جاتے ہیں کہ میں مسلمان نہیں ہوں تو پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں ان کو اپنا مذہب بتادوں گا۔ ایسا تو نہیں لگتا کہ وہ میرے ساتھ برا سلوک کریں گے۔ میں پہلے دن والی جگہ پر جا بیٹھا اور کچھ لوگوں نے پھر مشکوک نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ آقا

سیّد مرتضٰی نے بھی مجھے دیکھا۔ ان کی نگاہ بہت ہی معنی خیز اور پرنور تھی۔ درس کے درمیان ایک ادھیڑ عمر کا شاگرد اچانک اُٹھ کھڑا ہوا اور شکایتی لہجہ میں کہا:

''استاد، میں آپ کی خدمت میں کچھ کہنا چاہتا ہوں''۔

تمام شاگرد ساکت تھے۔ استاد نے کہا:

''اگر درس سے متعلق ہے تو کہو''۔

''نہیں استاد''۔

مسجد میں ایک ہمہمہ پیدا ہوا۔ جناب سیّد مرتضٰی نے کہا:

''پھر رُک جاؤ درس کے بعد''۔

ادھیڑ عمر والا آدمی دوبارہ مڑا اور شکن آلود نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر کچھ کہنے کے لیے اصرار کیا۔ میں خائف ہوا۔ اسے پہچانتا نہیں تھا۔ لیکن شاید وہ میرے ہی بارے میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ آقا سیّد مرتضٰی نے پھر بھی اس کی بات کو قبول نہیں کیا اور اپنا درس جاری رکھا۔

درس ختم ہونے کے بعد مجھے تشویش ہوئی کہ آقا سیّد مرتضٰی کے سامنے جاؤں اور ان سے شہریہ کی درخواست کروں یا نہ کروں۔ اس ادھیڑ عمر کے آدمی کے غضب ناک چہرے نے مجھے روکا۔ میں نے چاہا کہ مسجد سے باہر نکل جاؤں کہ اچانک اس شخص نے میری عبا کی آستین کو پکڑلیا اور مجھے آقا سیّد مرتضٰی کی طرف کھینچ کر لے چلا جو مسجد سے باہر نکلنا چاہ رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ چلایا:

''استاد!''

آقا سیّد مرتضٰی پلٹے اور کھڑے ہوگئے۔ میرا پورا وجود کانپنے لگا اور ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے۔ ادھیڑ عمر والے شخص نے میری طرف اشارہ کیا اور ان سے کہا:

''یہ شخص جو آپ کے درس میں آیا ہے مسلمان نہیں ہے۔ شاید آپ کے بارے میں کوئی برا ارادہ رکھتا ہو''۔

میں ڈر گیا۔ شاگردوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ جنابِ سیّد مرتضٰی میرے قریب آئے۔ میں بہت ڈرا مگر جس وقت وہ میرے قریب پہونچے تو اور زیادہ مہربان نظر آئے۔ اپنا ہاتھ میرے شانہ پر رکھا۔ میں گھبرا گیا۔ شاید انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔ شاگردوں نے اپنی بحث و گفتگو کو ختم کیا۔ سیّد مرتضٰی ایک عجیب انداز میں مسکرائے جس سے سر سے پیر تک میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ادھیڑ عمر والے آدمی کی بہت ذلت ہوئی۔ تعجب سے اُس کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جناب سیّد مرتضٰی نے کہا:

''بیٹے! کیا تم علم حاصل کرنا چاہتا ہے؟''

میرا دل دوبارہ بھر آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے رونا آ رہا ہے۔ شوق کا گریہ۔ اور میں نے جواب میں کہا:

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کا شاگرد بنوں''۔

ادھیڑ عمر والا آدمی غصے میں کہنے لگا:

''مگر یہ شخص یہودی ہے۔ میں نے اسے یہودیوں کے محلّہ میں بارہا دیکھا ہے''۔

آقا سیّد مرتضٰی نے اپنی تند نگاہوں سے اسے خاموش کر دیا اور اپنے ایک شاگرد سے مخاطب ہو کر کہا:

''اب یہ اس درس میں تم لوگوں کی طرح سے میرا شاگرد ہے۔ اس کے لیے ہر روز کا شہریہ[1] مقرر کرو اور اس کے کل اور آج کا شہریہ بھی اسے دے دو تا کہ اپنے بال بچوں کے لیے غذا مہیا کرے''۔

اس کے بعد وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور چلے گئے۔ میں حیران رہ گیا۔ میرے پورے جسم کو پالا مار گیا تھا۔ ہاتھ اور زبان لکڑی کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ آقا سیّد مرتضٰی اور ان کے شاگرد جا چکے تھے۔ میں تنہا تھا۔ ان کی دلنوازی اور ان کی پر معنی نگاہ

۱۔ شہریہ: وظیفہ جو طلبہ کو ان کی تعلیم اور تحقیقی امور کے لیے دیا جاتا ہے۔

کے نور کے ساتھ۔ سچ ہے، وہ مجھے پہچانتے تھے۔

یکے بعد دیگرے دن گذرتے رہے۔ میں آقا کی صحبت کا عادی ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مبارک اور نہ بھولنے والا دن آ پہنچا۔ وہ دن کہ جس روز میرے پر و بال نکل آئے اور میرے ساتھی طالب علم کے بقول میں 'مردِ آسمانی' ہو گیا۔ اس دن غیر ارادی طور پر درس میں جانے سے پہلے میں نے صاف ستھرا اور مناسب لباس زیبِ تن کیا۔ اپنی داڑھی اور کپڑوں میں عطر لگایا۔ ایسا محسوس ہوا کہ ابھی پیدا ہوا ہوں۔ یہ وہی دن تھا کہ میری زوجہ درس میں میرے جاتے وقت دروازہ کے قریب آئی اور روتے ہوئے مجھ سے خدا حافظی کی اور کہا:

''کاش میں بھی جناب سیّد مرتضٰی کی زیارت کرتی!''

اس روز درس کے بعد گھبراتے ہوئے جناب سیّد مرتضٰی کے قدموں پر گر پڑا اور کہا:

''جناب میں آپ کو دوست رکھتا ہوں... میں محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے فرزندوں کا عاشق ہوں''۔

جناب سیّد مرتضٰی کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے رنگین کمان کی طرح چمکنے لگے۔ جب میں نے ان کے گرم ہاتھوں کو اپنے چہرہ پر ملا، رو پڑا۔ طلبا بھی رونے لگے اور مسجد کے شبستان میں ایک شور بلند ہوا۔

جناب سیّد مرتضٰی کی آواز چھوٹی نہر کی طرح میرے دل کی سوکھی زمین کے رگ و ریشہ میں جاری ہو گئی کہ جس نے صدا دی:

''بیٹا! میرے ساتھ ساتھ پڑھو۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه''۔

میں نے ان کلمات کو دہرایا۔ ناگہاں میں نے خود کو ان کی خوشبو کی آغوش، طلبا کی آغوش اور اس ادھیڑ عمر والے مہربان شخص کی آغوش میں پایا۔

○○

نایاب کتاب

اطمینان سے مرغی کے انڈے کو اپنے جھولے میں رکھتی ہے۔تم حرم سے نظریں ہٹاتے ہو اور بڑے سکون سے مرغی کے انڈوں کو دیکھتے ہو۔اچانک کوئی چیز تمہاری نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔عورت کی چادر کے اندر سے کتاب کا ایک کونہ جھلک رہا ہے۔ وہ اپنے تھیلے تمہارے سامنے رکھ دیتی ہے۔تم فوراً ہی پوچھتے ہو کہ یہ کیا چیز ہے۔وہ تھیلے کو تمہارے حوالہ کردیتی ہے اور جواب میں کہتی ہے:

''کتاب ہے، اسے بیچنے کے لیے لائی ہوں''۔

تم کتاب اس کے ہاتھوں سے لے لیتے ہو اور غور سے اسے دیکھتے ہو۔حیرت زدہ ہوکر بلند آواز سے پڑھتے ہو:

''ریاض العلماء''۔

پھر بصد شوق اپنی قبا کی آستین سے اس کی جلد کے گردوغبار کو صاف کرتے ہو۔ تمہارے دل میں ہیجان برپا ہوگیا ہے۔چاہتے ہو کہ اُڑ جاؤ۔تمہاری خواہش ہے کہ تمام بازار کی مسافت ایک سانس میں طے کرجاؤ اور مدرسہ قوام تک پہنچ جاؤ۔طلبا کو اس کتاب کے بارے میں بتاؤ۔تم نے کتاب اپنے سینہ سے لگا رکھی ہے، جیسے حضرت یعقوب اپنے یوسف سے جا ملے تھے۔تم پوچھتے ہو کہ اس کتاب کی قیمت کتنی ہے۔

''پانچ روپیہ''۔

تم کو خوشی ہوتی ہے کہ وہ عورت کتاب بیچنے کے لئے تیار ہوگئی ہے۔خوشی سے کہتے ہو:

''میں اس کے لئے سو روپیہ دوں گا''۔

عورت حیرت سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوجاتی ہے۔

تم پیسے دینے کے لئے مدرسے کی طرف جانا چاہتے ہو،ناگاہ اپنے سامنے کسی کے سایے کو دیکھتے ہو۔

کاظم دلال اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہے اور بڑی نخوت وغرور سے کہتا ہے:

''کہاں؟''

پھر قریب آتا ہے۔کتاب تمہارے ہاتھوں سے چھین لیتا ہے اور عورت کی طرف منھ کرکے کہتا ہے:

''میں زیادہ قیمت دوں گا''۔

عورت حیرت میں پڑگئی ہے۔تمہاری پھول جیسی نگاہ کمھلا جاتی ہے،دل کو تکلیف ہوتی ہے۔کاظم دلال کو نجف کے سبھی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ہر پرانی خطی کتاب جو اس کے ہاتھ لگتی ہے اسے فوراً میجر کو، جو انگریزوں کی طرف سے حاکم ہے، دے دیتا ہے۔اور میجر اسے لندن کی لائبریری کو روانہ کردیتا ہے۔کوئی بھی کاظم دلال کو روکنے والا نہیں ہے۔وہ اپنی غضبناک نگاہوں سے عورت کے مرجھائے چہرہ کو دیکھتا ہے۔

تم ٹوٹے دل کے ساتھ حرمِ حضرت علیؑ کی طرف رُخ کرتے ہو۔تمہاری آنکھیں ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت ہوجاتی ہیں،درد سے زیرلب کہتے ہو:

''میرے مولا میں اس کتاب کے ذریعہ آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں،تو آپ اس بات پر راضی مت ہوئیے کہ یہ کتاب میرے ہاتھ سے نکل جائے''۔

تم دردِدل کررہے ہو کہ عورت اپنی نحیف وکمزور آواز میں کاظم دلال سے کہتی ہے:

''میں یہ کتاب تمہیں نہیں بیچوں گی۔یہ کتاب اس سیّد کی ہے''۔

کاظم دلال ڈھیر ہوجاتا ہے۔اپنی آنکھوں کو سخت کرتا ہے اور اپنی مونچھوں کے گوشوں کو ہلاتا ہے۔پھر ناگواری سے کتاب تمہارے حوالہ کردیتا ہے۔تھوڑی دیر بازار کی بھیڑ میں

گم ہوجاتا ہے۔تم کتاب کو بوسہ دیتے ہو اور اپنی عبا میں چھپا لیتے ہو۔پھر پلٹتے ہو اور عورت سے مخاطب ہوتے ہو کہ جلدی میرے ساتھ چل تا کہ میں تجھے کتاب کی قیمت ادا کردوں۔

○

تمہاری کل پونجی صرف بیس روپیہ ہے۔اپنے لباس اور گھڑی کو اپنے تھیلے میں رکھ کر عورت کے ساتھ حاجی حسین کی دُکان پر جاتے ہو۔تم حاجی حسین سے کچھ کہتے ہو۔وہ تمہارے لباس اور گھڑی کو گروی رکھ لیتا ہے۔تم پھر اس اہم اور نایاب کتاب کے بارے میں سوچنے لگتے ہو جو کسی بھی شیعہ عالم کے پاس نہیں ہے۔عورت برابر زیرلب بڑبڑاتی جارہی ہے۔تم شش و پنج میں سر جھکا لیتے ہو۔

''جناب، آپ نے مجھے کافی دیر سے ٹھہرا رکھا ہے۔وہ شخص تو ہاتھوں ہاتھ پیسہ دے رہا تھا''۔

عورت کبیدہ خاطر بڑبڑاتی ہوئی مدرسہ کے باہر انتظار کرتی ہے۔تم مدرسہ کے اندر جاتے ہو۔لباس اور اپنے اثاثہ کو بیچ کر بھی تم اس کے لیے سو روپیہ کا بندوبست نہیں کرسکے ہو۔تم انکساری کے ساتھ طلبا کے پاس جاتے ہو۔ایک ایک کمرہ میں جا کر ایک ایک طالب علم کو آواز دیتے ہو۔وہ باہر آتے ہیں اور تمہاری باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں۔ہر شخص جس کے پاس جس قدر بھی حقیر پونجی ہے وہ تمہارے حوالہ کردیتا ہے۔تم پیسوں کو گنتے ہو اور جلدی سے مدرسہ کے باہر جا کر عورت کو رقم دیتے ہو۔

اس وقت تمہاری رگوں میں خوشی کا احساس ہوتا ہے۔تمام تھکاوٹ تمہارے شانوں سے دور ہوجاتی ہے۔پیروں میں تازہ توانائی آجاتی ہے۔تمہاری آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے نم ہوجاتی ہیں۔

تم مدرسہ میں واپس آتے ہو۔کاظم دلال سپاہیوں کے ساتھ مدرسہ میں گھس جاتا ہے اور بدخوئی پر اُتر آتا ہے۔طلبا طیش میں آتے ہیں۔کاظم دلال تمہاری طرف اشارہ کرتا ہے۔کچھ سپاہی تمہاری طرف آجاتے ہیں اور تم کو مدرسہ سے باہر نکال کر لاتے ہیں۔

تم اطمینان وسکون کے ساتھ ان کے ہمراہ چلتے ہو۔تم کتاب کے بارے میں سوچنے لگتے ہو جسے محفوظ جگہ پر رکھ چھوڑا ہے،لگتا ہے انگریز اس کتاب کی قدر و قیمت کو جان گئے ہیں۔

○

ایک رات نم ناک زندان میں رہنا تمہارے لیے ولولہ انگیز ہے۔آخرکار نجف کے ایک بزرگ مرجع[۱] کی طرف سے کچھ لوگ میجر کے پاس آتے ہیں۔وہ بات منظور کرلیتا ہے لیکن بڑی لجاجت سے اصرار کرتا ہے کہ اگلے مہینہ تک کتاب کو اس کی تحویل میں دے دیں۔

آج مدرسہ کے طلبا کے درمیان بڑی گہما گہمی ہے۔انہوں نے بڑی خوشی سے تمہیں چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور کتاب دیکھ کر حیرت میں پڑگئے ہیں۔کام جلدی شروع ہوجانا چاہیے۔تم کتاب کو ان کے درمیان رکھتے ہو اور صدق دلی سے کہتے ہو کہ اب ہمیں چاہیے کہ دانشمند گرامی علامہ آفندی[۲] کی اس بیش بہا اکلوتی کتاب کی نقل کرلیں۔ایک مہینہ سے زیادہ کا وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔جلدی کرو کہ دعائے حضرت امیرؑ تمہارے شاملِ حال ہے۔

کتاب کو نقل کرنے کے بعد نجف کے مرجع بزرگ کو دیتے ہو۔جب تم کو پتہ چلتا ہے کہ کتاب انگریزوں کے ہاتھ نہیں لگی ہے اور مرجع بزرگ نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا ہے تو خوشی سے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہو[۳]۔

○○

---

۱. مرجع بزرگ نجف: مرحوم آیۃ اللہ حاج مرزا فتح اللہ غازی معروف بہ شیخ الشریعہ۔

۲. علامہ آفندی: عراق میں شیعوں کے ایک بڑے عالم۔

۳. جوان طالب علم مرحوم آیۃ اللہ العظمیٰ سیّد شہاب الدین عرشی نجفی ہیں۔یہ واقعہ ۱۴۴۱-۱۴۴۰ قمری ہجری میں عراق میں پیش آیا۔

پہاڑ کی مانند شخص

تانگہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا اور میں اندر ہی اندر پیچ و تاپ کھا رہا تھا۔ میرا دِل ہر چیز سے متنفر ہوگیا تھا۔ زمین و زمان کو کوس رہا تھا۔ بوڑھے تانگے والے نے اپنی پہلوی نیلی ٹوپی سے اپنی پیشانی چھپا رکھی تھی اور اپنی چھوٹی آنکھوں سے آگے کو تک رہا تھا۔ اس کا کالے رنگ کا مضبوط گھوڑا بھی بے خیالی میں زمین پر ٹاپیں مار رہا تھا۔ اور میں ہونٹ چبا رہا تھا اور غصہ سے اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ کالا گھوڑا باغوں، دُکانوں اور گھروں سے ہوتا ہوا کوتوالی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ مگر کس قدر سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ کاش میں اپنے ساتھ موٹر لایا ہوتا تو جلدی کوتوالی پہونچ جاتا اور کسی تاریک و تنہا گوشے میں جا کر سوجاتا تاکہ تھوڑی دیر کے لیے تمام باتیں میرے ذہن سے محو ہوجائیں۔ اگر جنرل فون سے نتیجہ پوچھتا ہے تو مجھے کیا کہنا چاہیے اور کس زبان سے کہوں کہ وہ مان جائے اور ہمارے تعلقات خراب نہ ہوں۔ جنرل کیا کہے گا۔ شاید فون وزیر کو دے دیتا اور وزیر، وزیر اعظم کو اور..... میرا جسم اعلیٰ حضرت رضا خان کے نام سے لرز گیا۔

جنرل نے کہا تھا کہ سیدھے بغیر کسی تامّل اور پس و پیش کے، لیکن ظاہر میں ٹھیک ٹھاک طریقہ سے اس کے گھر جاؤ گے، پھر احترام کے ساتھ اس کے سامنے دو زانو بیٹھو گے، لیکن ذلّت کے ساتھ نہیں بلکہ عقیدت اور اظہارِ لطف کے انداز میں، پھر بہت ہی رسمی طریقہ سے میرے پیغام کو ان تک پہنچا دینا۔

میں نے ہر پہلو پر غور کرلیا تھا سوائے اس کے کہ وہ یعنی حاجی شیخ محمد تقی بافقی[1] کمر سیدھی کریں اور مجھے کھوٹی کھری سنائیں اور انکار کا گھونسہ میرے سینہ پر دے ماریں۔ جس نے تیز خنجر کی طرح میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ ایسا زخم جو میرے سینہ پر داغ چھوڑ گیا۔ اس وقت میں تھا، میری تنہائی تھی اور زبردست دباؤ تھا جس نے میرے شانوں کو بھاری کردیا اور میرے سر پر ہتھوڑا بجا دیا۔

تانگہ جتنا کوتوالی سے قریب ہوتا جا رہا تھا اتنا ہی میرا تھکا ہارا دل اپنے گہرے زخم کو زیادہ نمایاں کر رہا تھا اور درد بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے خود سے کہا:

''کاش کہ میں نے اسے قبول نہ کیا ہوتا اور نہ جاتا''۔

لیکن میرے شانہ پر آویزاں سخت و نمایاں بلوں کا کیا ہوتا، جنرل ایک آن میں اسے جھپٹ لے گا اور پھول کی پتّی کی طرح اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دے گا اور پھر مجھے کوتوالی کے سپاہیوں کی صف میں کھڑا کردے گا۔

مجھے یہ کام قبول کرلینا چاہئے تھا سو کرلیا، مگر اس بات کی طرف دھیان نہیں گیا تھا۔ یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی، قیدی اور جلاوطن شیخ میرے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوں گیا اور اعلیٰ حضرت کے تخت و تاجِ کیانی کو ایک بال کے عوض بھی نہیں خریدیں گے۔

تانگہ ابھی بھی راستہ میں تھا۔ تہران سے اجنبیت کی بُو آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جنرل میرے حق میں بہت زیادہ لطف و کرم کرے گا تو مجھے زاہل یا خاش جیسے دور دراز علاقے میں بھیج دیگا۔

۱۔ حاج شیخ محمد تقی بافقی: رضا خاں ان سے بہت زیادہ خوف زدہ رہا کرتا تھا۔ وہ آیۃ اللہ حائری یزدی کے زمانہ کے قم کے علماء میں سے ہیں۔ وہ اپنی جرأت اور دلیری سے رضا شاہ اور اس کے عوامل سے دو دو ہاتھ کرنے اور حق بات کہنے میں ڈرتے نہیں تھے۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں وہ قم میں معتوب کیے گئے اور ۱۳۲۱ قمری دُنیا سے رحلت فرمائی۔ ان کا جسم اقدس حضرت معصومہ کے حرم میں دفن ہے۔

میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کاش جب شیخ قم سے شاہ عبدالعظیم آئے تھے تو اسی دن سے ان پر سختی کرتا اور دنیا کو اس کے لئے تلخ کر دیتا تا کہ کوئی غلطی نہ کریں اور اپنی سرخ زبان کو حلق میں رکھیں۔ کاش کہ ان کے گھر کو ہارون کے زندان کی طرح بنا دیتا اور ان کے بیوی بچوں کو بھی قم پہنچوا دیتا۔ وہ رہ جاتے اور صحن کے اندر بنا چھوٹا سا حوض اور کچے کمرے جس سے بدبو آتی رہتی اس وقت وہ علیل و بیمار پڑ جاتے۔ کاش میں روزانہ کسی نہ کسی بہانے سے اسے کوتوالی میں کھینچ لاتا۔ اس کی جان کے پیچھے پڑ جاتا اور ان کی لمبی داڑھی کو نوچ لیتا۔

میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اوپر سے یہ حکم آیا تھا کہ ان سے براہِ راست دست و گریبان نہیں ہونا ہے۔ وہ ہمارے قسم خوردہ دشمن تھے۔ ہم نے قم میں دیکھا تھا کہ کس طرح ہنگامہ برپا کیا تھا اور کس طرح تنِ تنہا شہر اور حرم میں آشوب برپا کر دیا تھا اور اعلیٰ حضرت کو برا بھلا کہا تھا۔

میں نے فقط دور سے اس کے صفات سن رکھے تھے۔ میں نے سوچا تھا جوان آدمی ہوگا، لحیم شحیم لمبا تڑنگا، مگر وہ بوڑھا تھا، منکسر، سر جھکا ہوا اور چاق چوبند۔ ساری بہادری اور ہیبا کی اس کی روشن آنکھوں میں تھی، جن کو ایک لمحہ دیکھنے کی بھی میرے اندر تاب نہ تھی۔

جب میں نے اس کے گھر میں قدم رکھا تو مٹی اور گھاس پھوس کی مہک نے میرے مشام کو آزار پہنچایا۔ اس گنبد نما محقر گھر میں میرا دل بیٹھنے لگا اور نزدیک تھا کہ میرا دم گھٹ جائے۔ میں نے خود سے کہا کہ:

''میں بہت جلد حکم کو اس تک پہنچا دوں گا اور پھر حکومت کے لیے اسے خرید لوں گا اور اس کے شر سے نجات مل جائے گی''۔

مگر افسوس کہ حاجی شیخ کی بات کڑکتی بجلی تھی جس نے میرے پتہ کو پانی کر دیا اور میرے وجود کو ہلا دیا۔

کوتوالی آنے والا تھا۔ شکست خوردہ، خالی ہاتھ اور منہ لٹکائے ہوئے۔ اپنے دل کو سکون پہونچانے کے لئے مجھے خود ہی جنرل کو فون کرنا چاہئے۔ یہ طریقہ بہتر ہوگا۔ اور میں اس کشمکش سے بھی نکل جاؤں گا۔ بعد میں موقع دیکھ کر اس آشوب گر حاجی شیخ کے لیے زبردست پلان بناؤں گا اور اسے پریشان کروں گا۔

تانگہ کوتوالی پہنچ گیا اور اس کے بڑے سے باغ کی طرف چل پڑا۔ باغ کے وسط میں ایک بڑے سے تالاب کے دلکش منظر نے میرے خیال کو راحت بخشی۔ ہلکاپن محسوس ہوا۔ کاج اور چنار کے درختوں پر چڑیوں اور خوش گلو پرندوں نے تازہ محفل سجا رکھی تھی۔ کچھ جنگلی کوؤں کی خشک اور دھیمی دھیمی کائیں کائیں کی آواز میرے ذہن میں برے تصورات لا رہی تھی۔ بوڑھے تانگے والے نے اپنی پہلوی ٹوپی کے سرے کو اوپر اُٹھایا پھر پوری قوت سے تانگہ کی ڈوری کو اپنی طرف کھینچا۔ کالے گھوڑے نے اپنے منہ کو ایک طرف کھینچا اور ہنہناتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

کچھ سپاہی آئے اور تانگہ کے قریب صف بستہ ہوگئے۔ سروان اکبری نے احترام سے تانگہ کا دروازہ کھولا اور مجھے فوجی سلام کیا۔ سپاہی چوکس ہو کر کھڑے ہوگئے اور دونوں پیروں کو ملا لیا۔ ہمیشہ کی طرح مجھے ان کے اس عمل سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ان سب کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے میں اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں نے سروان کو کنکھیوں سے دیکھا اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا:

''سروان میرے ساتھ آؤ، تم سے کام ہے''۔

اس نے فرمانبرداری کی اور کانپتے ہوئے سایہ کی طرح میرے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کوتوالی کے سارے سپاہی یہاں تک کہ افسران بھی اسی طرح تھے۔ سبھی میرے سامنے کانپتے ہوئے سایہ کی مانند تھے جو مجھے دیکھتے ہی خود کو بھول جاتے تھے۔ اصلاً شہر کے تمام لوگ یہاں تک کہ صاحبانِ منصب اور قابلِ اعتماد افراد بھی اسی طرح تھے۔ مگر یہ حاجی شیخ...

کوتوالی میں بنے پتلے سے دالان میں جس نے بھی مجھے دیکھا یا وہیں دور سے خود کو آڑ میں کرلیا یا جب میرے پاس پہونچا تو مجسمہ کی طرح ساکت کھڑا ہوگیا۔ بے دلی اور تشویش کے عالم میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ سروان نے دونوں پیر جوڑے اور سیلوٹ کیا۔ میں نے اپنی ٹوپی اُتاری، فوراً ہی اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ مگر صرف اس لیے کہ میری گھبراہٹ کو نہ بھانپ لے۔ میں نے اپنے چہرہ کو نارمل ظاہر کیا اور کہا:

''آج چاہتا ہوں کہ چھٹی لے لوں۔ تم خود کوتوالی کو سنبھالو''۔

اس نے فوراً ہی کہا:

''بہت خوب جنابِ سرہنگ''۔

اور میں نے پرسکون انداز میں اشارہ سے اسے کہا:

''جاؤ''۔

وہ چلا گیا اور دروازہ بند کرگیا۔ میں نے جلدی سے ریسیور اُٹھایا۔ جتنا جلد ہوسکے شیخ سے ملاقات کے بارے میں جنرل کو بتانا چاہئے۔ اگرچہ اس بات کو کہنے کے لئے بہت زیادہ حوصلہ اور ہمت چاہئے۔ شاید پولیس میں میرے ہونے اور نہ ہونے سے متعلق تھی۔ اگر میں فون کروں تو یہ بہتر ہوگا۔ ریسیور اُٹھایا اور کہا:

''جنرل کا نمبر ملاؤ، بہت جلدی''۔

میں کھڑا ہوگیا اور کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ کھڑکی کے پیچھے گیا اور بادلوں کے ان ٹکڑوں کو دیکھا جنہوں نے آسمان کی چوڑائی اور وسعت کو گھیر رکھا تھا اور لگتا تھا کہ شانہ بشانہ دھیرے دھیرے چل رہے ہیں۔ مجھ پر خوف طاری ہوا: ''خدانخواستہ کہیں بات خراب نہ ہوجائے۔ اگر جنرل آپے سے باہر ہوگیا تو کیا ہوگا''۔

ٹیلی فون کی طرف بھاگا۔ چاہا کہ ریسیور اُٹھاؤں مگر پس وپیش میں پڑ گیا۔

''نہیں... یعنی کیوں... لیکن... جنرل۔ یہ منھ پھٹ آدمیوں میں سے ہے''۔

میں اور گھبرا گیا۔ برزخ میں اٹکا ہوا تھا۔ زمین و آسمان کے درمیان۔ ریسیور اُٹھایا۔ ٹیلی فون آپریٹر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

''جناب جنرل کا فون مشغول ہے۔ منتظر ہوں کہ لائن خالی ہوجائے''۔

میں نے ہلکی سی خوشی کے لہجہ میں کہا:

''فی الحال ان کا نمبر نہ ملاؤ۔ میں بعد میں خود ہی بتاؤں گا''۔

ریسیور رکھ دیا اور کرسی پر ڈھیر ہوگیا اور سوچنے لگا۔ تشویش سے بھری فکر، پریشان موجوں کی طرح، میرے دماغ میں نیچے اوپر ہورہی تھیں اور مجھے آزار پہنچا رہی تھیں۔ اچانک میرے خیال کو جھٹکا لگا۔ قلم اور دوات لے آیا۔ سفید کاغذ پھیلایا، شاید بہتر یہی تھا کہ لکھ ڈالوں۔ ایک رپورٹ کے عنوان سے۔ ایک کام کی چھوٹی سی رپورٹ۔ اس طرح سے یقیناً یہ بہت ہی رسمی ہوگی اور جناب جنرل کو پرسکون رکھے گی اور دوسری بات یہ کہ میں جملوں کو آب و تاب دے سکتا ہوں۔ اس طرح یہ نوشتہ حاجی شیخ کے سیاہ کارناموں میں ضمیمہ ہوجائے گا۔ میں نے قلم کو سیاہ روشنائی میں ڈبویا اور جناب جنرل کو مخاطب کرتے ہوئے اطمینان سے لکھنا شروع کردیا۔ پہلے اس کے احترام میں القاب و سلام اور دلنشیں فقرے قلمبند کیے اور پھر لکھا:

''جناب جنرل، آپ کے حکم کے مطابق۔ جس وقت حاجی شیخ محمد تقی بافقی سے روبرو ہوا تو اس نے مجھ سے بے اعتنائی برتی۔ میں آپ کے فرمان کے مطابق مصالحت اور فریب کے راستے سے کہا کہ میں اربابِ حل وعقد کی طرف سے مامور ہوا ہوں کہ آپ کو جن چیزوں کی حاجت ہے اسے فراہم کردوں اور جو کچھ بھی آپ چاہیں اسے انجام دوں۔ مگر حاجی شیخ جو ہمیشہ کی طرح بے نیاز اور سخت تھے، اچانک آتش فشاں کی مانند ہوگئے۔ پرخاش کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ ''تم کون ہو جو میری ضرورتوں اور حاجتوں کو پورا کرنے کا دعویٰ کررہے ہو''۔

جناب، میں حیران تھا کہ کیا کہوں۔ وہ پھر گڑبڑ کرنا چاہتا تھا کہ۔ میں نے اس کی سفید داڑھی پر رحم کھایا اور اسی اطمینان سے کہا:

''ہم صلح کرنا چاہتے ہیں تا کہ یہ فتنہ ختم ہوجائے''۔

وہ پہلے سے زیادہ غضبناک ہو اُٹھا۔ اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ اس کی آنکھیں سیّال آگ کے دو پیالوں جیسی ہوگئی تھیں۔ اس کے دیکھنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ وہ ہم سے صلح نہیں کرے گا اور اپنی ضد پر اڑا رہے گا، مگر اس طرح نہیں۔ اس نے کہا:

''مجھے ضرورت ہے کہ اس صاف شفاف موسم میں آسمان میں بادل چھا جائے اور بارش ہونے لگے تا کہ زمین سرسبز ہوجائے۔ تم میری اس خواہش کو پوری کرسکتے ہو؟''

میں نے بے زاری سے ہنستے ہوئے کہا:

''نہیں... نہیں کرسکتا ہوں''۔

اس نے طنز بھری مسکراہٹ سے کہا:

''کیا تم سے اونچے افسران اسے انجام دے سکتے ہیں؟''

میں نے کہا:

''نہیں''۔

اس نے پھر پوچھا:

''اور اونچے لوگ کیا اسے انجام دے سکتے ہیں؟ جیسے رضا خاں''۔

اس سے منہ در منہ تکرار سے بچنے کے لئے اور اس کے غصہ کے خرمن میں لگی آگ پر ٹھنڈا پانی ڈالنے کے لئے بے پروائی اور طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا:

''نہیں''۔

وہ یعنی وہی طلبۂ آشوب گر کہ جس نے قم کو درہم برہم کر رکھا تھا اور بھوکے لوگوں

کو اُکسایا تھا، اچانک کان پھاڑ دینے والی آواز سے چلایا:

''پھر تم جب اپنی کمزوری، اعلیٰ افسران اور ان سے بڑے افسران کی کمزوری اور عاجزی کا اقرار کرتے ہو تو کیونکر میری ضرورتوں کو پورا کرو گے؟ میں تمہارے جیسے عاجز و ناتواں افراد اور مملکت کے سربراہوں سے کیا مان سکتا ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ اور شرک آمیز باتیں نہ کرو''۔

یقین فرمائیں میں بیکار اُٹھے ہوئے خمیر کے ٹکڑے کی طرح ہوکر رہ گیا اور اپنے خیالوں کے تنور میں جل کر خاک ہوگیا۔ میں کیا کرسکتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ دماغ چکرا رہا تھا اور میرا دِل جگہ جگہ سے زخموں سے چور چور تھا۔

میں نے چاہا کہ لات گھونسے سے اس کی خبر لوں مگر میرے دل پر وحشت طاری تھی اور میرا جسم کانپنے لگا۔

یہاں تک پہونچا تھا کہ قلم ہاتھ کے پسینہ میں تر ہوگیا اور پھسلنے لگا۔ میرا دماغ جھنجھنا رہا تھا۔ جب میں نے خط پر نگاہ ڈالی تو میرا دِل بالکل بیٹھ گیا۔ یہ مزخرف باتیں کیا تھیں جو میں نے لکھی تھیں۔ اگر جناب جنرل اسے پڑھتا اور میری درماندگی و لاچاری کو دیکھتا تو میرا قصہ تمام تھا۔ میں نے اس کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے دہلا دیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور اُٹھایا۔ جناب جنرل نے دوسری طرف سے پوچھا:

''سلام سرہنگ، کیا ہوا؟ بافقی کو جال میں پھنسالیا؟''

○○

بوعلی کی نماز

بوعلی اپنے گھر کے صحن کے ایک گوشہ میں پختہ چبوترے پر افسردہ و غمگین بیٹھے ہوئے اپنے خیالوں کی دُنیا میں غرق تھے اور اس کتاب کی یاد ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔

جب اپنی گمشدہ شی یاد آتی تو انہیں دکھ ہوتا اور ان کی حالت غیر ہوجاتی تھی۔ ایسی حالت جو انہیں تمام کاموں سے روک دیتی تھی اور سوچ میں غرق کردیتی تھی۔ ان کے لیے اب کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس نایاب کتاب کی خاطر ہر شہر و دیار کی خاک چھان ماری تھی اور مختلف کتابخانوں میں دیکھا تھا لیکن اس کتاب کا کچھ پتہ نہیں مل سکا تھا۔ کیا کرسکتے تھے۔ جس قدر بھی ہوسکتا تھا کیا۔ مہینوں کی مستقل تگ و دو اور تلاش و جستجو بے نتیجہ تھی اور وہ اسی طرح افسوس میں مبتلا تھے۔

بوعلی کو اپنی تحقیقات کے لیے فلسفہ کی اس اہم کتاب کی ضرورت تھی۔ یہ وہ کتاب تھی جسے یونان کے ایک قدیم دانشور نے لکھی تھی اور بوعلی کبھی بھی اس کتاب کو بھول نہیں سکتے تھے۔

بوعلی نے ایک لمبی آہ کھینچی۔ ان کی آنکھوں کے گوشہ سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے اور ان کی چھوٹی سی داڑھی پر باریک دھار بناتے ہوئے نیچے گر پڑے۔ بوعلی کی زوجہ جو کمرہ میں تھیں صحن میں آئیں۔ ان پر نگاہ پڑی تو دیکھا وہ پھر غمگین و پریشان ایک نقطہ پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ کچھ کہنا چاہا، اتنے میں بوعلی

اپنی زوجہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ فوراً ہاتھ سے اپنے آنسوؤں کو پوچھا اور بہت ہی تیزی سے ایک کتاب جو اُن کے ہاتھ میں تھی اسے کھولا اور ورق گردانی کرنے لگے۔ ان کی زوجہ نے جو اُن کے درد کو اچھی طرح سمجھتی تھیں کچھ نہیں کہا اور کمرہ میں واپس چلی گئیں۔

بوعلی دوبارہ خیالوں میں کھو گئے۔ تکلیف سے اپنے گھٹنوں کو ایک دوسرے سے ملایا اور اپنے چہرے کو اس پر رکھا۔ دل ہی دل میں دھیرے دھیرے بدبدائے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، ان کے شانے کانپنے لگے اور ان کے دبلے پتلے ہاتھ میں رعشہ ہوگیا۔ چپکے چپکے رونے لگے اور ان کا گھٹنا آنسوؤں سے تر ہوگیا۔ ان کی زوجہ بھی رونے لگیں۔ وہ کمرہ کے اندر سے تمام چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں لیکن کچھ کرنہیں سکتی تھیں۔

اچانک بوعلی نے اپنا سر اوپر اُٹھایا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں کے نیچے سوجن آ گئی تھی۔ التجا آمیز نگاہ آسمان پر ڈالی۔ فوراً ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شاید ان کے ذہن میں کوئی تازہ خیال آ گیا تھا۔ ایک آخری چارۂ کار انہیں نظر آ گیا جس کے بارے میں اب تک سوچا نہیں تھا۔

کتاب کو ایوان میں رکھا۔ آستین کو اُوپر چڑھایا اور گھر کے بڑے حوض کے کنارے وضو کیا پھر شہر کی جامع مسجد کے ارادہ سے گھر سے باہر نکل گئے۔ وہ شہر کی ایک گلی سے دوسری گلی ہوتے ہوئے معمول سے زیادہ تیز تیز قدم بڑھا رہے تھے۔

شہر کی جامع مسجد دور سے دکھائی دی۔ بوعلی نے اپنی رفتار اور بڑھادی اور تھوڑی دیر بعد مسجد پہنچ گئے۔ اگرچہ ظہر کا وقت نہیں ہوا تھا اور اذان میں ابھی کافی وقت تھا لیکن مسجد کھلی ہوئی تھی۔ بوعلی مسجد کے شبستان میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر بعد نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ایسی نماز جس کی اس وقت انہیں ضرورت تھی، آرام و اطمینان سے دو رکعت نماز (حاجت) ادا کی۔ نماز کے بعد سجدہ میں گئے اور رونے لگے۔ وہ بڑی

عاجزی سے رو رہے تھے اور خدا سے اپنی اہم شے کو پانے کے لئے مدد مانگ رہے تھے، وہ خدا جو اُن کا محبوب اور مقصود تھا، جس نے ہمیشہ ان کی مدد کی۔ سجدہ کو تمام کیا۔ اپنی جگہ سے اُٹھے اور مسجد سے باہر نکل گئے۔ لگتا تھا دل کو سکون مل گیا اور افکارِ پریشان کا ہجوم ان کے دل و دماغ سے نکل چکا ہے۔

لوگوں کا شور وغل ہر طرف سے بلند تھا۔ ہر شخص نے اپنی بساط پھیلا رکھی تھی اور سامان بیچ رہا تھا۔ بوعلی اس شور وغل سے بے نیاز چلے جا رہے تھے۔ ابھی چند قدم چلے تھے کہ ایک آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ ایک بوڑھی عورت کی کانپتی ہوئی آواز تھی جو کتاب بیچ رہی تھی۔ بوعلی نے اپنا سر گھمایا۔ اُن کی نگاہوں نے اس بوڑھی عورت کو وہاں پایا اور بے اختیار اس کی طرف مڑ گئے۔ بوڑھی عورت اکیلی اور افسردہ تھی۔ شاید کوئی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اس کے سامان میں پرانی کتابیں نظر آ رہی تھیں۔

بوعلی نے سوچا کہ واپس ہو جائیں لیکن ان کے دل میں ایک خیال آیا اور خود سے کہا:

''شاید یہ کتابیں میرے درد کا علاج ہوں''۔

ان میں سے ایک کتاب کو اپنے ہاتھوں میں لی اور اس کے گرد و غبار کو اپنی آستین کے گوشہ سے صاف کیا۔ ناگہاں ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ کیا دیکھ رہے تھے۔ کتاب کو خوب اُلٹا پلٹا اور اس کے صفحات کی ورق گردانی کی۔ وہی کتاب تھی۔ ان کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور آنکھیں شوق کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ حیرانی کے عالم میں بوڑھی عورت کی طرف رُخ کیا اور کہا:

''ماں اس کتاب کی کیا قیمت ہوگی؟''

بوڑھی عورت نے بوعلی کی طرف دیکھا اور حسرت و یاس سے کہا:

''چند درہم سے زیادہ نہیں ہے۔ تم جو بھی دے دو گے لے لوں گی''۔

بوعلی نے اپنے پیسوں کی تھیلی میں ہاتھ ڈالا اور جس قدر بھی اس میں تھا بوڑھی عورت کے حوالہ کر دیا۔ بوڑھی عورت نے بوعلی سے ان پیسوں کو لیا اور شوق سے کہا:

''اے جواں مرد خدا تمہیں نیکی عطا کرے''۔

بوعلی نے دوسری کتابوں پر بھی نظر دوڑائی۔ کوئی بھی کتاب ان کے کام کی نہیں تھی۔ بوڑی عورت جو بوعلی کی نظروں کا مشاہدہ کر رہی تھی ان کی جانب رُخ کیا اور کہا:

''میرے جد ایک عالم دین تھے۔ یہ کتابیں ان سے ہمیں وراثت میں ملی ہیں۔ میں انہیں آج لاچاری کے سبب بیچنے کے لیے یہاں لائی ہوں تا کہ اپنے بچوں کے لیے ہو سکے تو کھانا مہیا کروں''۔

بوعلی کے اندر شوق کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بہت ہی خندہ دلی سے اس بوڑھی عورت کا شکریہ ادا کیا اور بڑی تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے راستہ میں کتاب کو اپنے سینہ سے دبائے رکھا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

○○

نماز فارسی زبان میں

میں اپنے پیروں کو برآمدے کی سیڑھیوں پر ملا کر رکھے ہوئے تھا اور سر تکیہ پر تھا کہ کوریے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

چیں...چیں چیں...چیں...چیں۔

میں نے اپنی آنکھیں آواز کی طرف گھمائیں۔ چڑیا پتوں کے بیچھے چھپی تھی۔ میری پلکیں برابر پھڑک رہی تھیں کہ میں کسی خیال میں محو ہو گیا۔

''مرزا ہاشم، سلام۔ یہ بچے، جیسا کہ میں نے کہا، آپ کے پرانے شاگرد ہیں''۔

ہم لوگ چار آدمی تھے جنہیں مکتب کے بوڑھے ملا مرزا ہاشم نے گھور کر دیکھا۔

علی مراد کے والد نے ان سے کہا کہ:

''یہ بچے اپنی نمازیں فارسی میں پڑھتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

ان کی آنکھوں سے بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔

''کیا؟ خدا کی پناہ!''

علی مراد کے والد بے اختیار دھیرے سے ہنسے۔ مگر فوراً ہی خود کو سنبھالا اور کہا:

''جب بچے تھے تو آپ کے مکتب میں آتے تھے اور عربی سیکھتے تھے''۔

مرزا نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے پر مارا۔ ان کے ہاتھوں کی سبزی مائل پھولی

ہوئی رگیں اور اوپر اُٹھ گئیں۔

''عربی زبان بھی پڑھی ہے اور پھر بھی..... لا الٰہ الا اللہ''۔

علی مراد کے والد نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

''یہ اپنی نمازیں فارسی میں پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عربی میں نماز پڑھنے کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہم ان سے جیت نہیں سکتے''۔

مرزا کی آنکھیں سرخ اور بڑی ہو گئیں۔ مرزا اپنے گھر میں قالین بننے کا کام کرتے تھے اور صبح سویرے مکتب میں جو اُن کے گھر کے باہری کمرہ میں تھا بچوں کو عربی الف، بے پڑھاتے تھے۔

الف دو زبر 'اَ'، اور دو زیر 'اِ'، اور دو پیش 'اُ'۔

میں اور دوسرے بچے ان کے سات آٹھ سال پہلے کے شاگرد تھے۔ وہ علی مراد کے والد کی طرف غصے سے مخاطب ہوئے۔

''کفر مت بکو مراد۔ یہ کیا بیکار کی بات ہے''۔

اور میں نے عباس کو گھور کر دیکھا۔

''عباس دیکھو... بحث نہ کرنا''۔

عباس نے گویا میری بات سنی ہی نہیں، دبے دبے لفظوں میں کہا:

''خوب! ہم اپنے لیے دلیل رکھتے ہیں۔ ابھی اسی وقت...''

مرزا کی صورت متغیر ہو گئی۔

''ہر بات نصیحت اور میٹھی زبان میں صحیح نہیں ہوتی ہے۔ چاہیے کہ...''

ہم لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ علی مراد کے والد ہم سے پہلے ان کے گھر سے باہر نکل آئے۔

○

رات ہوتے ہی اسمٰعیل کی بہت ہی ہلکی سی آواز دروازہ کے پیچھے سے میرے

کانوں میں آئی۔

''میں ہوں، رضا دروازہ کھولو''۔

جلدی سے میں نے دروازہ کھولا۔ ہنسا اور سلام کیا اور کہا:

''میرے بابا کو تم سے کچھ کام ہے''۔

میں نے تعجب سے بس اسے دیکھا۔ اس نے پھر کہا:

''میں نہیں جانتا... فقط اتنا کہا کہ جلدی سے ہمارے گھر آؤ''۔

میں نے کہا:

''ٹھیک ہے...''

میں واپس مڑا کہ کپڑے پہن لوں۔ بابا چوکھٹ کے بیچ میں کھڑے تھے۔

''کہاں، اس وقت، رات میں۔ کیا حاجی مکہ سے آئے ہیں؟''

رات کے آٹھ بجے تھے۔ اسمٰعیل نے ہماری باتیں سنیں اور قریب آیا۔

''محسنی صاحب سلام علیکم۔ معاف فرمایئے، میں نے آپ کو تکلیف دی۔

میرے بابا کو رضا سے اس وقت کچھ ضروری کام ہے''۔

بابا نے نہ تو تعجب کیا، نہ اگر مگر کہا، اور کچھ پوچھا بھی نہیں۔ فقط مسکرائے:

''جاؤ... جلدی واپس آ جانا رضا''۔

مجھے ان کے اس عمل سے تعجب ہوا۔ عجیب بات ہے کہ کچھ کہا بھی نہیں اور اجازت دے دی۔

ہم گھر سے باہر نکلے اور چل پڑے۔

''کیا کام ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

سر کو اُوپر اُٹھایا۔

''مجھے نہیں معلوم، مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا''۔

ہم لوگ ان کے گھر پہنچے جو ایک گلی میں تھا۔ ایک قدیمی چھت والی رہگذر، پانی

سے بھری ایک نہر سے تھوڑا آگے۔

میں نے ان کے گھر میں قدم رکھا۔ ان کے بابا کو صحن میں دیکھا۔

''سلام''

''سلام جناب رضا سدا بہار، خوش آمدید!''

وہ بھی بابا کی طرح مسکرائے۔

''میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حاجی رحیم ارباب صاحبؒ کی ملاقات کے لیے میں نے وقت لیا ہے''۔

''کیوں کیا ہوا ہے؟''

ارباب صاحب کا نام بہت سنا تھا، ایک بزرگ اور نامی گرامی ہستی تھے۔ بابا ہمیشہ انہیں معرفت اور نیکی سے یاد کیا کرتے تھے۔

''اسی پرانی بحث کے سلسلہ میں۔ فارسی میں نماز پڑھنے کے بارے میں کہہ رہا ہوں''۔

میں ہنسا، اب اسمٰعیل کے والد بھی میرے بابا کی طرح اس ماجرا میں شامل تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ ہر نامہ ان کے اور بابا کے ہاتھ کا تیار کردہ ہے۔

''خوب ٹھیک ہے! آپ جب کہیں''۔

''کل ظہر کے بعد۔ غروبِ آفتاب سے ایک دو گھنٹے پہلے''۔

○

ارباب صاحب سکون سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا گھر سادہ اور قدیمی تھا۔ ان کے کمرے سے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ چاروں طرف کتابوں کا شیلف تھا۔ ان کے صحن میں ایک باغیچہ تھا جس کے پھول زیادہ تر سرخ اور گلاب کے تھے۔ ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ کاندھے پر عبا اور سر پر کھال کی بنی ایک اُونچی سی ٹوپی تھی۔

''میرے نونہالو! خوش آمدید!''

ہم سب کی احوال پرسی کی، بابا نے راستہ میں مجھے بتادیا تھا کہ وہ تمام بڑے لوگوں کے استاد اور عالم ہیں۔ وہ خود تمام علوم میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔

''کس اسکول میں پڑھتے ہو؟''

تمام بچوں نے ایک ایک کرکے ان سے گفتگو کی۔ تب جا کر میری باری آئی۔ ہم پندرہ لوگ تھے۔ میرے والد کے ساتھ علی مراد اور رضا کے والد اور کچھ دوسرے بزرگوار تھے۔ ایک نوجوان آدمی پہلے چائے لایا پھر کچھ پلیٹوں میں مٹھائی، انار اور سیب لے آیا۔

''بسم اللہ کیجیے۔ یہ پھل بسم اللہ کی لذّت اور قربت الی اللہ کی حلاوت[1] سے حلال ہوگئے ہیں''۔

ہر ایک سے کچھ سوال پوچھے۔ کسی سے ریاضی، کسی سے سائنس، کسی سے دینیات کے بارے میں اور پھر الجبرا، مثلثات اور فزکس کی بابت پوچھا، ہم ان کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکے۔ علی مراد کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

''ہماری کتابوں میں سے کہاں سے یہ سوالات پوچھے ہیں۔ کس قدر پڑھے لکھے ہیں''۔

جوان آدمی نے چینی چائے کی ٹرے ہمارے قریب کھسکائی۔ ایک پیالی اُٹھائی، اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ ارباب صاحب کی ہنسی کی طرح۔

۱۔ بزرگ عالم حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ حاج آقا رحیم ارباب ۱۲۹۷ قمری اصفہان کے موضع چہ مہین میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ اہلِ شعر و ادب اور تاریخ تھا۔ انہوں نے بچپن میں ہی حوزہ کے دروس میں دسترس پیدا کرلی تھی اور بہت جلد علم کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوگئے۔ ان کا کلاس زیادہ تر اصفہان کی مسجد حکیم میں ہوتا تھا۔ شہید مطہری، شہید بہشتی، شہید مفتح اور علامہ جلال الدین ہمائی ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ وہ فقیہ، ادیب، فلسفی، استادِ اخلاق اور سائنس و ریاضی کے ماہر تھے اور تقریباً سو سال زندگانی کی۔ ۱۳۵۳ شمسی ۱۹/ آذر کو عید غدیر کے دن دُنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کا مقدس جنازہ اصفہان کے تختِ فولاد کے مضافات تکیہ ملک میں دفن ہوا۔

''ماشاء اللہ سبھی حاضر جواب ہو، تم لوگوں کی نگاہیں معصوم ہیں۔ اور اچھی گفتگو بھی کرتے ہو''۔

ان کا ایک ہاتھ عبا کے اندر تھا اور جو باہر تھا اسے گفتگو کے وقت بڑے آرام سے کبھی اوپر اُٹھاتے اور کبھی نیچے لاتے۔

پوری طرح ہم لوگوں کی طرف متوجہ تھے اور مہربان، فرمایا کہ چونکہ تم لوگ فارسی میں نماز ادا کرتے ہو اس بنا پر تمہارے والدین فکرمند ہیں۔ انہیں علم نہیں کہ میں ایسے لوگوں کو پہچانتا ہوں کہ اصلاً نعوذ باللہ نماز ہی نہیں پڑھتے ہیں۔

ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ آقای ارباب بھی ہمارے اس پروگرام کے بارے میں جانتے ہیں۔

''تم لوگ صاف ستھرے نوجوان ہو۔ دیندار بھی ہو اور صاحبِ ہمت و جستجو بھی۔ میں بھی جوانی میں تمہاری طرح فارسی میں نماز پڑھنا چاہتا تھا لیکن کچھ پریشانیاں سامنے آئیں اور میں ایسا نہ کرسکا''۔

ہم لوگ خاموش تھے۔ صرف ہم لوگوں کے کان اور آنکھیں ان کے بھورے اور موٹے ہونٹوں پر ٹکی ہوئی تھیں جو مہندی سے رنگی ان کی داڑھی میں سے کبھی کبھی دِکھائی دے جاتے تھے۔

آج تم لوگوں نے میری جوانی کی خواہش کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ تمہارے اوپر آفرین ہے۔

ہم میں سے کچھ نظریں جھکائے حیران تھے۔

اس زمانہ میں میری سب سے پہلی مشکل سورۂ حمد کے صحیح ترجمہ کی تھی کہ یقیناً تم لوگوں نے اسے حل کرلیا ہے۔ لہٰذا تم میں سے کوئی ایک مجھے بتائے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ کس طرح کیا ہے؟

بے اختیار نگاہیں عبداللہ کی طرف اُٹھ گئیں جو ہم سب میں اچھی طرح گفتگو کرلیتا

تھا۔وہ بھی ہچکچائے بغیر اپنے ہاتھ کو اوپر اٹھایا۔

''میں تیار ہوں''۔

جناب نے اس کے جسم پر نگاہ ڈالی۔

''خوب! خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مد مقابل صرف ایک شخص ہے۔ ورنہ میں پندرہ طاقتور نوجوانوں سے تنہا نہیں نپٹ سکتا تھا''۔

وہ اپنی تمام تر معلومات اور علم و دانش کے باوجود شکستہ نفسی کر رہے تھے۔

''خوب! میرے بیٹے اپنے ترجمہ کو سناؤ''۔

عبداللہ دو زانو ہو کر بیٹھا اور اپنے دونوں شانے اُچکائے۔

''بنامِ خداوند بخشندۂ مہربان (مہربان بخشنے والے خدا کے نام سے)''

مجھے نہیں لگتا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ یہ ہوگا۔ ''بسم'' کا ترجمہ تو ہوتا ہے نام، مگر اللہ قابلِ ترجمہ نہیں ہے۔ خدا اسم خاص ہے جس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کا نام حسن ہو تو اس کے معنی کو اس سے بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اس سے نہیں کہا جا سکتا ''زیبا'' کیونکہ اسے اچھا نہیں لگے گا۔ اسی لئے لفظ ''اللہ'' کو جس طرح ہے اسی طرح استعمال کرنا چاہئے۔

''ہاں رحمٰن کے سلسلے میں تم نے کہا بخشندہ یعنی بخشنے والا۔ یہ ترجمہ برا نہیں ہے مگر مکمل نہیں ہے کیونکہ رحمٰن خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے جس سے بخشندگی کے علاوہ اس کا لطف بھی ظاہر ہوتا ہے، یعنی رحمٰن وہ خدا ہے جو اس دُنیا میں مومن اور کافر دونوں پر رحم کرتا ہے اور سب کو اپنی رحمت و بخشندگی کے سایہ میں قرار دیتا ہے''۔

وہ ایک سانس میں بولے جا رہے حالانکہ وہ ضعیف تھے مگر دل جوان تھا اور زبان میں طاقتِ گویائی تھی۔

''مگر ''رحیم'' کے معاملہ میں تم نے ''مہربانی'' کے معنی لیے۔ رحیم قرآنی

لفظ ہے اور خدا کا نام ہے، لہٰذا معنی صحیح ہونے چاہیے۔ اگر اس کا ترجمہ بخشنے والا کرتے تو شاید صحیح ہوتا۔ رحیم یعنی خدا وہ ہے جو اس دُنیا میں مومنوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہے''۔

کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''بہرحال جو کچھ تم نے کہا برا نہیں ہے، مگر مکمل نہیں اور اس میں کچھ غلطیاں ہیں''۔

ہم لوگوں پر ایک ایک نظر ڈالی۔ میں نے بچوں کی طرف دیکھا، سبھی سر جھکائے ہوئے تھے اور کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ مگر انہوں نے دوبارہ کہا۔

''میرے نونہالو! میں نے بھی جوانی کے دنوں میں ایسا ارادہ کیا تھا، مگر ان مشکلوں کے سبب باز آیا اور فارسی میں نماز ادا کرنے سے صرفِ نظر کی۔ یہ تو صرف سورۂ حمد کی پہلی آیت تھی، اگر دوسری آیتوں کے سلسلہ میں غور کریں تو موضوع بہت ہی پیچیدہ اور دشوار ہو جائے گا، مگر...''۔

مگر کیا، اپنی نگاہوں کو گھمایا، ایک سرخ سیب چھوٹے قاب سے اُٹھایا اور اسے سونگھا۔

''مگر میرا ماننا ہے کہ اگر تم لوگ اپنی بات پر اڑے رہتے ہو اور فارسی زبان میں نماز ادا کرنے سے باز نہیں آتے ہو تو اس کا پڑھنا نہ پڑھنے سے بہتر ہے''۔

ان کے کلام سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اب شرمندگی کے سبب میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنا چہرہ اوپر اُٹھاؤں۔ میرا سر اور چہرہ پسینہ سے تر بتر تھا۔

پہلے عبداللہ، پھر ایک ایک کر کے ہم سب بولے:

''ہمارا راستہ غلط تھا۔ آپ نے ہمارے دل کو روشن کر دیا''۔

جناب ہنسے۔ ایسا لگتا تھا گویا ان کی گہری اور محبت پاش نگاہوں نے ایک بڑے باغ میں نیا دَر کھول دیا ہو۔

''میں نے صرف فارسی زبان میں نماز پڑھنے کی مشکلات کے بارے میں تم سے گفتگو کی ہے''۔

ان کے اشارہ پر مٹھائی کی سینی دست بدست گھومی۔ آقا نے جب اپنی عبا کے اندر سے دوسرے ہاتھ کو باہر نکالا تو ہم لوگوں نے اس کو بوسہ دیا۔ دیدار کی لذّت تمام ہوگئی اور پھر نماز کے لیے ہمارے دل مؤذّن کی طرف متوجّہ ہوئے۔

اللہ اکبر

○○

نوجوان مجتہد

تم نے ادب سے کہا:

''ماموں جان[1]! آپ کے کل کے درس کے سوال کے لیے بجائے ایک جواب کے میرے پاس دو جواب ہیں''۔

ماموں جان کا چاند جیسا وجیہ چہرہ تمہاری طرف مڑا۔ انہوں نے تعجب سے کہا:

''یعنی محمد باقر[2] تم... جواب''۔

تم نے دونوں جوابوں کو ٹھہر ٹھہر کر اور اہم اور محکم دلائل کے ساتھ بیان کیا۔ ان کی حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ تم تو پرسکون ہوگئے مگر وہ پیچ و تاب میں مبتلا تھے۔ تم نے اپنی گردن جھکا لی اور ان کے تبسم کا خوبصورت غنچہ کھل اُٹھا۔ تمہاری عمر تیرہ سال تھی اور وہ تمہارے علم کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ تم ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے اور وہ تمہارے اجتہاد پر غور کر رہے تھے۔

انہوں نے کہا:

''نا قابلِ یقین ہے، نا قابلِ یقین ہے۔ بارک اللہ محمد باقر۔ شاباش محمد باقر! میرے پاس اس اہم فقہی سوال کا صرف ایک ہی جواب تھا''۔

---

۱. مرحوم آیت اللہ عظمیٰ شیخ محمد رضا آل یاسین نجف میں شیعہ علماء میں سے ایک بزرگ عالم۔

۲. شہید آیۃ اللہ العظمیٰ سیّد محمد باقر صدر

تم نے کچھ نہیں کہا اور انہوں نے کہنا شروع کیا: ''تمہارے عزیز دادا مرحوم سیّد اسمٰعیل[1] کے پاس بھی جو کہ ہمارے استاد تھے ایک ہی جواب تھا، لیکن تم نے تلاش و زحمت سے دوسرا جواب بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس سن میں علم و تحقیق کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچ جاؤ گے''۔

تم نے پھر بھی کچھ نہیں کہا اور تمہارے دل کے صاف و شفاف آسمان پر ایک لمحے کے لیے بھی غرور کے بادل نہیں چھائے۔ یقیناً ماموں جان اپنے دل میں کہہ رہے ہونگے کہ:

''یہ تیرہ سالہ نوجوان، دانا اور تجربہ کار مردوں کی طرح ہے''۔

انہوں نے دوبارہ دہرایا: ''یقین نہیں آتا۔ آفرین محمد باقر تم بہت ذہین ہو''۔

تم نے ایک شیریں چشمہ کی مانند اطمینان و سکون سے اور متفکر انداز میں انہیں دیکھا اور پھر اپنے شانوں پر ان کے ہاتھوں کی گرمی کا احساس کیا اور ان کی مہربان آواز آہستہ آہستہ تمہارے کانوں میں آہنگ پیدا کرنے لگی۔

''جب سارے طلاب آجائیں تو یہ دونوں جواب ان کے سامنے بیان کرنا''۔

تم نے سادہ اور پاک نگاہوں سے اسے قبول کرلیا اور ایک گوشہ میں جا بیٹھے۔ طلبا ایک ایک کر کے آنے لگے اور درس کی جگہ پر اکٹھا ہوگئے۔ ماموں جان نے کہا:

''جس نے بھی کل کے مسئلہ کا جواب ڈھونڈ لیا ہو وہ بتائے''۔

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ سبھی خاموش تھے۔ وہ لوگ جو تم سے بڑے تھے اور بعض تیس سال کے اوپر تھے۔

ماموں جان نے فوراً کہا:

۱۔ آیت اللہ العظمیٰ سیّد اسمٰعیل صدر عراق میں شیعہ علماء میں سے ایک بزرگ عالم۔ ۱۴۰ ہجری قمری کے نیمہ اوّل میں سے تھے۔

''ہم تحصیلِ علم کے دوران اس مسئلہ کا صرف ایک ہی جواب تلاش کرپائے، مگر آج سیّد محمد باقر اس ذہین نوجوان نے اس جواب کے علاوہ دوسرا محققانہ اور عمیق جواب ڈھونڈ نکالا ہے جسے وہ خود تم لوگوں سے بیان کریں گے''۔

کچھ لمحوں کے لیے طلبا میں خاموشی چھا گئی۔ خاموشی کے ٹوٹنے کے بعد ہر شخص اپنے بغل والے سے کچھ کہہ رہا تھا۔ شاید انہوں نے یہ سوچا ہوگا کہ سیّد محمد باقر جیسے تیرہ سالہ نوجوان کون سا محققانہ جواب ڈھونڈھ نکالا ہوگا۔

تم نے آوازوں کو خاموش کیا۔ ماموں جان نے تمہاری طرف پدرانہ نگاہ کی اور کہا:

''محمد باقر اپنا جواب بیان کرو''۔

تم کھڑے ہوئے۔ بغیر کسی تشویش اور غرور کے اطمینان سے اپنے دلنشیں جواب کو اپنے ہم جماعتوں کو شرح و تفصیل سے بتایا۔

○○

سونے کی تھیلیاں

آقا سیّد آپ کیوں رنجیدہ اور غمگین ہیں۔حکومت والوں سے خدا کی پناہ! یہ لوگ جو مال وزر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ صحن کے پانچ کوشوں والے حوض نے اپنا منھ کھول دیا ہے اور ان فقروں کو سیّد رضی کی نظروں میں ڈال رہا ہے۔اطمینان سے حوض کے کنارے بیٹھتے ہیں۔اپنی آستینوں کو اوپر چڑھاتے ہیں، پھر حوض کے ٹھہرے ہوئے اور باتوں سے بھرے ہوئے حوض کو دیکھنے لگتے ہیں جس کی آنکھوں کو آسمان کی تصویر نے نیلی کردیا ہے۔

سیّد رضی سینہ سے ایک آہِ سرد نکالتے ہیں کہ ایک نوزائیدہ بچہ کے رونے کی پیاری آواز نے ان کی نظروں کو کسی کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی کی طرف موڑ دیا۔ان کا دل پھر سے غمگین ہوگیا۔یہ ان کے لختِ جگر کی آواز ہے جو ابھی ابھی دُنیا میں وارد ہوا ہے۔سورج ایک سانس میں شدت کے ساتھ گرمی دے رہا تھا اور پرندے کچھ درخت کے پتوں اور شاخوں کے درمیان بیٹھے ہوئے چہچہا رہے تھے۔

سیّد رضی سوچتے ہیں کہ ان کی آمد نے میرے بیٹے کی ولادت کی حلاوت کو تھوڑی دیر کے لیے تلخ کردیا۔

بے اختیار ان کی نگاہ گھر کے لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے دروازہ کی طرف مڑگئی۔انہیں یاد آیا کہ دروازہ کی زنجیر بند نہیں کی ہے۔سونے کے سکّوں کی چھوٹی

تھیلیاں پھر سے ان کی نظروں میں گھومنے لگیں۔ان کے سینہ کے اندر درد اور گھٹن کا احساس ہونے لگا، اور گلا اندر سے خشک ہوگیا۔دوبارہ اس نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز گھر میں بلند ہوئی۔گھر کی کوئی عورت کھڑکی کے قریب آتی ہے اور کمرہ کی جالی دار کھڑکی کو جو باغیچہ کی طرف ہے کھول دیتی ہے تاکہ باغ اور اس کے درمیان بڑے بڑے پیڑوں کی تازہ ہوا کمرہ میں آئے۔

سیّد رضی بسم اللہ کہتے ہیں اور حوض کے صاف و شفاف پانی میں سے ایک چلّو پانی اپنے چہرہ پر ڈالتے ہیں، پھر فرح بخش انداز میں وضو کرکے کھڑے ہوجاتے ہیں۔دروازہ کی طرف پلٹتے ہیں۔دروازہ پر پہنچتے ہی لکڑی کے حلقہ میں پڑی زنجیر کو کھولتے ہیں کہ دفعتاً ابی محمد وزیر[1] کے آدمی کی آواز انہیں فکرمند کردیتی ہے۔دوبارہ ذکر میں مشغول ہوجاتے ہیں۔تمام فکر و خیال کو جھٹک دیتے ہیں اور اپنے چھوٹے سے کتاب خانہ کی طرف جو صحن مدرسہ کے ایک گوشہ میں ہے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہیں۔

وزیر کے آدمی کو گئے ہوئے کچھ گھنٹے گذر چکے ہیں۔وہی جو بے شرمی سے ان کے (سیّد رضی) گھر میں قدم رکھا تھا۔اس کے پیچھے تین غلام تھے، جن میں سے ایک کے سر پر ایک بڑی سی سینی تھی۔جب سے سید رضی سے سامنا ہوا تھا برابر ہنسے جارہا تھا۔اور سینی کی طرف دیکھ رہا تھا۔گلی کے باہر حکومت کے کچھ مسلح افراد پہرہ دے رہے تھے۔

سیّد رضی نے ان لوگوں کو دیکھ کر اپنی نظریں اُٹھائیں اور منتظر ہوئے کہ ابی محمد وزیر کا آدمی کچھ بولے اور وہ بجائے اس کے کہ کچھ کہے اپنے غلاموں میں سے ایک قوی ہیکل اور کالے رنگ کے غلام سے کہا کہ سر پر رکھی ہوئی سینی کو سیّد کے سامنے رکھ دے، دوسرے دو غلام سینہ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوگئے۔سیّد رضی کو تعجب ہوا۔ان کے پیروں میں ہلکا سا ارتعاش ہوا۔سینی بڑی اور بھاری تھی اور اس کا حجم کچھ زیادہ ہی تھا۔اس

۱۔ ابی محمد: ابی محمد مہلبی، بہاؤالدولہ دیلمی کا وزیر (شاہان آل بویہ میں سے) تھا۔ایک مدت تک آل بویہ کا شیعی سلسلہ بغداد اور عراق کے کچھ شہروں پر قابض تھا۔

بڑھے ہوئے حجم کو زربافت سرپوش سے ڈھانک رکھا تھا۔ یہ وہ موقع تھا کہ جب سیّد نے ایک جھرجھری سی لی اور ان کے دل میں وزیر کے اس عمل سے ناراضگی پیدا ہوئی۔

کوتاہ قد اور کان کی لوں تک گھنی مونچھوں والے وزیر کے آدمی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

''فرزند نورسیدہ کا قدم مبارک ہو''۔

اور اپنے ہاتھوں کو باہر کی طرف نکلے ہوئے پیٹ پر پھیرا۔ کمر خم کی اور پھر کہا:

''خدا کرے کہ آپ کا بیٹا سو سال زندہ رہے اور اپنے والد کی طرح علاّمہ اور خدا شناس ہو''۔

سیّد رضی کو محسوس ہوا کہ وہ بے حال ہو رہے ہیں اور ان کا سر چکرا رہا ہے۔ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے پلٹنا چاہتے تھے تا کہ اپنی لائبریری کی طرف چلے جائیں، مگر وہ لوگ مہمان تھے اور ان کے گھر کے صحن میں کھڑے تھے۔

سیّد رضی نے سینی کو بغور دیکھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ حکومت کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ ان کے بیٹے کی ولادت کے نام پر اور دراصل خود ان کی توجہ مبذول کرانے کے لیے۔

وزیر کا آدمی آداب و اصول کے ساتھ بیٹھ گیا اور سنہرے تاروں سے بنے سرپوش کو آہستہ سے ایک طرف ہٹایا۔ غلاموں نے اُچک کر دیکھا۔ طبق میں چھوٹی چھوٹی تھیلیاں قرینہ سے رکھی ہوئی تھیں۔ سیّد رضی کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور ان کے دل میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ نظر ہٹانا چاہا لیکن وزیر کے آدمی نے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ چند تھیلیوں کو اُٹھایا اور انہیں ادھر سے ادھر کیا۔ تھیلی کے اندر سونے کے سکّوں کی جھنکار نے غلاموں کو زیادہ حریص کردیا۔ سیّد رضی نے سر اٹھایا۔ زیر لب استغفار کیا۔ انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ یہ جرات کریں کہ ان کے گھر کے آنگن میں سکّوں سے بھری سینی لائیں اور ان کے سامنے رکھیں۔ سیّد کا شیشہ دل چور چور ہوگیا اور

ان کی آنکھوں کے خوبصورت کٹورے اشک پنہانی سے چھلکنے لگے۔

وزیر کا آدمی جو سیّد رضی کی بے اعتنائی سے مبہوت تھا، فوراً چرب زبانی سے کہا:

''دو ہزار دینار ہیں۔ میرے مالک ابن محمد وزیر کی طرف سے ہدیہ ہے۔ آپ کے فرزند نورسیدہ کے تولد کی خاطر''۔

سیّد رضی نے فوراً ہی اپنی تیز نگاہ اس کے چہرہ پر ڈالی اور کہا:

''نہیں۔ وزیر یقیناً یہ جانتے ہیں، اور اگر نہیں جانتے تو ان سے کہیے کہ میں کسی سے بھی صلہ قبول نہیں کرتا ہوں''۔

غلاموں نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وزیر کے فرستادہ کی لویں پھڑکنے لگیں، اس کی آنکھوں کے نچلے پپوٹے متورّم ہوگئے۔ کچھ کہنا چاہا مگر سیّد کی ہیبت نگاہ نے اس کے منہ پر تالا لگادیا۔ سمجھ گیا کہ اب نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ سیّد کے سامنے اس سے زیادہ چرب زبانی اور اصرار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاتھ سے غلاموں کو اشارہ کیا کہ طبق کو اُٹھالیں۔ غلاموں نے فی الفور طبق کو اُٹھالیا، اور اس کے پیچھے سبھی سر جھکائے سہمے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ سیّد رضی حوض کے پاس گئے اور پہاڑ کی مانند اپنے دلی غصہ کو حوض کے نیلے پانی کو دکھایا۔

چند گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی وہی غم انہیں پریشان کر رہا تھا۔ اور ان کی نگاہیں ان تھیلیوں کے دیکھنے کی وجہ سے عجب بے چینی کا شکار تھیں۔ لکھنے کی چھوٹی میز کے پیچھے بیٹھتے ہیں اور ایک ضخیم خطی کتاب کو کھولتے ہیں مگر اس کے جملے نظروں سے صاف دِکھائی نہیں دیتے۔ بے چینی اور پریشانی کے عالم میں دیوار سے ٹیک لگاتے ہیں اور آنکھیں بند کرلیتے ہیں تا کہ کچھ آرام مل جائے۔

اچانک دستک کی پے در پے آواز نے ان کے خیالوں کو درہم برہم کردیا۔ اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہیں اور کتاب خانہ کی کھڑکی سے دروازہ کی طرف نظر ڈالتے ہیں۔ گھر کا نوکر دروازہ کی طرف جاتا ہے اور زنجیر کو کھولتا ہے۔ سیّد رضی کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔

وزیر کے آدمی کا آدھا دھڑ انھیں دکھائی دیتا ہے۔

پھر ابی محمد کا آدمی۔

اُٹھتے ہیں، جوتے پہنتے ہیں اور صحن میں آتے ہیں۔ خادم ان کے قریب آتا ہے اور چاہتا ہے کہ کچھ کہے کہ سید رضی کہتے ہیں:

''میں جانتا ہوں۔ میں خود جواب دوں گا۔ تم کمرہ میں جاؤ''۔

خادم تعجب سے ہٹ جاتا ہے۔ سید رضی دروازہ کے قریب جاتے ہیں اور اسے آدھا کھولتے ہیں۔

''جناب استاد سلام۔ ہم ابی محمد کی طرف سے...''

سید رضی اس کو آگے نہیں بولنے دیتے۔

''دوبارہ ابی محمد۔ وہ کیا چاہتا ہے؟''

پھر ان غلاموں کی طرف دیکھتے ہیں جن کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوا ہے نظر گھماتے ہیں۔ اسی ہٹے کٹے غلام کے سر پر سینی ہے۔ ان کا دل دوبارہ درد و غم سے بھر گیا۔

''حضور سید! ابی محمد وزیر نے کہا ہے کہ اگر آپ اس ہدیہ کو اپنے لیے قبول نہیں فرماتے ہیں تو انہیں ان عورتوں کو مرحمت فرمائیں جنھوں نے آپ کے فرزند کے پیدا ہونے میں مدد کی ہے''۔

سید رضی غصہ ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ طے ہوا ہے کہ اس بار دائی کے بہانے اتنے سارے سونے کے سکے ان کے گھر میں داخل ہو جائیں۔ وزیر کا آدمی اپنے موٹے جسم کو تھوڑا قریب لاتا ہے تاکہ صحن میں داخل ہو جائے۔ سید رضی اسے منع کرتے ہیں اور سختی سے کہتے ہیں:

''اسے جناب ابی محمد کے پاس واپس لے جایئے اور ان سے میری طرف سے کہہ دیجیے کہ دائی خود ہماری گھر کی عورتیں ہیں، اور ہمارے گھر کی یہ رسم نہیں ہے کہ بے گانہ عورتیں گھر میں آمد و رفت کریں۔ ہمارے گھر کی

خواتین کسی سے ہدیہ قبول نہیں کرتی ہیں''۔

وزیر کے آدمی کی آنکھیں تعجب سے پھٹی رہ جاتی ہیں۔ اس کی ناک کا سرا سرخ ہو جاتا ہے اور اس کی چوڑی پیشانی پر پسینہ کے قطرہ نمودار ہونے لگتے ہیں۔ لگتا ہے یہ بات اس کے لیے ناقابلِ یقین ہے۔ غلام اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

سید رضی پھیکی ہنسی ہنستے ہیں۔ دروازہ کو دھیرے سے بند کرتے ہیں اور اس پر زنجیر چڑھا دیتے ہیں اور پہلے سے زیادہ غمگین اپنے کتاب خانہ کی طرف تیزی سے قدم بڑھاتے ہیں۔

○

یہ تیسری مرتبہ ہے کہ سید رضی اور خادم دروازے کے پاس ٹھٹھک جاتے ہیں۔ دوبارہ ابی محمد وزیر کا آدمی، کچھ غلام اور کارندے گھر کے دروازہ پر لائن سے کھڑے ہیں۔ سید رضی غضبناک ہو جاتے ہیں اور اسے سخت سست کہتے ہیں۔

''تم لوگ آخر مانتے کیوں نہیں ہو، اب کیا بات ہے؟''

وزیر کا فرستادہ جو تھوڑا ڈرا ہوا ہے کہتا ہے:

''جناب، مجھے حکم ملا ہے اور میں مجبور ہوں۔ صرف وزیر کے فرمان کی بجا آوری کے لیے آیا ہوں''۔

سید رضی سر پر چھوٹی گول ٹوپی اور جسم پر قبا اور عبا ڈالے ہوئے ہیں، سر جھکاتے ہیں اور اپنے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ وزیر کا آدمی خوش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر آپ خود اس سینی کو قبول نہیں فرماتے تو اسے ان طلبا کے درمیان تقسیم فرما دیں جو آپ کے مدرسہ میں پڑھتے ہیں۔

سید رضی سر اٹھاتے ہیں اور اسے گھورتے ہیں۔ وزیر کا فرستادہ خوف سے اپنی نگاہ سید رضی سے ہٹا لیتا ہے۔ سید رضی سوچنے لگتے ہیں۔ اس کو جواب دینا چاہتے ہیں لیکن نہیں دے پاتے ہیں۔ پس و پیش میں تھے۔ عاجز تھے کہ کیا کہیں کیونکہ طلبا اپنے معاملہ

میں خود اختیار رکھتے ہیں۔مزید برآں کہ وہ فقیر اور نادار بھی ہیں۔سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہیں۔سبھی رکے ہوئے ہیں تا کہ ان کا جواب سنیں۔اچانک انہوں نے کہا:

''ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں''۔

پھر اپنے کتاب خانہ کی طرف جاتے ہیں تا کہ عمامہ سر پر رکھ لیں اور ان کے ساتھ مدرسہ علمیہ کی طرف جائیں۔

مدرسہ کے بوڑھے خادم نے بڑی دقّتوں سے سبھی طلاب کو چھوٹے کلاس روم میں جمع کیا۔سیّد رضی آتے ہیں اور خلاف معمول نیچے بیٹھ جاتے ہیں اور پریشانی کے عالم میں سر جھکا لیتے ہیں۔کوئی چارہ نہیں ہے،اب طلاب کی بات ہے۔وہ اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے ہیں۔زیادہ تر طلبا غریب ہیں اور ان میں بہتیرے ایسے ہیں جن کے جسم پر سالم قبا تک نہیں ہے۔

سیّد رضی کے اشارے پر مدرسہ کا خادم صحن مدرسہ میں آتا ہے اور تھوڑی دیر بعد سر پر سینی رکھے ہوئے وزیر کے آدمی کے ہمراہ کلاس روم میں آتا ہے۔طالب علم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور آپس میں کھسر پھسر (سرگوشی) کرنے لگتے ہیں۔سیّد رضی ابھی بھی گھبرائے ہوئے ہیں،خادم جس کا جسم اس ہٹے کٹے غلام کا آدھا بھی نہیں ہے بڑی محنت سے سینی کو کلاس روم کے بیچ میں رکھ دیتا ہے۔سیّد رضی کے حکم کے مطابق تمام غلام اور اہلکاران کے کمرہ میں چلے گئے ہیں تا کہ طلبا کو ان کے آنے کی خبر نہ ہو۔

ابی محمد کا آدمی بہت امید کے ساتھ جاتا ہے اور طبق کے پاس کھڑا ہوجاتا ہے۔مدرسہ کے تھوڑے سے طلبہ طبق کے چاروں طرف پہلو بہ پہلو اڑس کر بیٹھے ہوئے ہیں اور سوالیہ نگاہوں سے طبق اور وزیر کے آدمی کو دیکھتے ہیں۔ان میں سے کوئی اپنے دوست سے کچھ پوچھتا ہے اور پھر زیادہ تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہے اور طبق کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔

وزیر کا آدمی سیّد رضی سے اجازت مانگتا ہے۔سیّد رضی اپنے سفید رومال کو پیشانی

کے پسینے کے قطروں پر رگڑتے ہیں اور سر ہلاتے ہیں۔وزیر کا آدمی فوراً سینی کے سنہرے روپوش کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور ایک تھیلی کو ہاتھ میں لیتا ہے۔کلاس روم میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہوتا ہے۔وزیر کا آدمی تھیلی کے منھ کو کھولتا ہے اور سکوں کو سینی میں اُنڈیل دیتا ہے۔طلبا خاموش ہوجاتے ہیں۔

سیّد رضی اس سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں:

''یہ ہیں مدرسہ کے طلاب...''

پھر طلبا کی جانب رُخ کر کے سکون سے مگر غمگین لہجے کے ساتھ فرماتے ہیں:

''جس کو بھی ان پیسوں کی ضرورت ہو وہ جائے اور اٹھالے''۔

طلبا شور مچانے لگتے ہیں۔خادم حیرانی سے ان کو دیکھتا ہے۔اچانک سبھی چپ ہوجاتے ہیں۔کوئی اپنی جگہ سے ہلتا بھی نہیں ہے۔وزیر کا آدمی سوچنے لگتا ہے۔پھر بہت ہی محتاط طریقہ سے کھلی ہوئی تھیلی کو خالی کرتا ہے۔سونے کے سکّوں کی کھن کھن کی آواز وہ واحد آواز تھی جو کلاس روم میں گونج رہی تھی۔اس اُلّو کی طرح جو بسرعت پرواز کرتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے۔

اب کوئی بھی طالب علم شور وغوغا نہیں کرتا اور وہ سبھی سیّد رضی کو دیکھ کر متعجب ہوتے ہیں۔پھر اپنے سروں کو جھکا لیتے ہیں۔سیّد رضی بے چینی محسوس کرتے ہیں۔

''جو شخص بھی ضرورت مند ہو وہ لے سکتا ہے''۔

پھر بھی کوئی اپنی جگہ سے ہلتا نہیں ہے۔وزیر کا آدمی شرم سے اپنا ہاتھ تھیلیوں سے ہٹالیتا ہے اور ان سے نظریں چراتا ہے۔اچانک ایک جوان طالب علم کلاس روم کے درمیان سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔سب اسے دیکھنے لگتے ہیں۔سیدھے آقا سیّد رضی کی طرف جاتا ہے اور دُکھ بھرے لہجہ میں کہتا ہے:

''مجھے بہت تھوڑے سے پیسوں کی ضرورت ہے لیکن یہ بھی لاچاری کے وجہ سے ہے''۔

سیّد رضی نے ایک ہلکے سے تبسم سے اس کی تائید کی۔ جوان طالب علم قریب جاتا ہے اور خادم سے کچھ کہتا ہے۔ شدید سناٹے نے مدرسہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ خادم فوراً جاتا ہے اور جلد ہی پلٹ آتا ہے پھر کوئی چیز جوان طلبہ کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ سارے طلبا اپنی گردنیں بلند کرتے ہیں اور اسے بغور دیکھتے ہیں۔ جوان طلبہ کے ہاتھ میں لوہا کاٹنے والی ایک چھوٹی سی قینچی ہے۔ سیّد رضی ابھی تک سر جھکائے ہوئے ہیں۔ جوان طالب علم تھیلی میں سے باہر نکلے ہوئے سکّوں کے پاس جاتا ہے۔ ایک سکّہ اُٹھاتا ہے اور اسی قینچی سے ایک چھوٹا ٹکڑا اس میں سے کاٹتا ہے۔

حیرت اور تعجب سے بھرا ہوا ایک شور بلند ہوتا ہے۔ وزیر کے آدمی کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ اپنی سرخ شال کے ایک کونہ سے اپنے چہرہ اور گردن سے پسینہ پونچھتا ہے۔ جوان طالب علم کھڑا ہوتا ہے اور سیّد رضی کی طرف جاتا ہے اور شرمندگی سے کہتا ہے کہ بس اسی قدر کافی ہے۔ یہ اپنے لیے نہیں ہے بلکہ اپنا قرض ادا کرنے کی خاطر ہے۔ میں نے سادہ زندگی کی عادت ڈال لی ہے۔

سیّد رضی کا چہرہ کھل اٹھتا ہے لیکن گھبراتے ہوئے اس کی طرف منہ کر کے کہتے ہیں:

''بیٹے! تم نے اتنی سی مقدار کیوں لی۔ ایسی کیا مشکل آ گئی تھی''۔

جوان طالب علم اپنے استاد کے سامنے بیٹھ جاتا ہے اور نہایت رنج سے کہتا ہے:

''آج رات پڑھتے وقت میرے چھوٹے سے چراغ کا تیل ختم ہوگیا اور میں کتاب کے اہم حصہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مدرسہ کے خادم کے پاس گیا۔ موجود نہیں تھا۔ اسٹور کا دروازہ بھی مقفل تھا۔ مجبوراً حاجی یعقوب دُکاندار کے پاس گیا اور تھوڑا سا تیل چراغ کے لیے اُدھار لیا۔ اب چونکہ آپ نے اجازت مرحمت فرمائی تھی اور آپ کی تائید بھی محسوس کی تو ایک لحظہ کے لیے مجھے اپنے قرض کی یاد آ گئی اس لیے مجبور ہوگیا۔ بس اسی قدر لیا ہے تا کہ جتنا جلد ہوسکے میں حاجی یعقوب کے قرض سے چھٹکارا

پاسکوں''۔

کلاس روم میں ابھی بھی گہرا سناٹا چھایا ہوا ہے، ہلکی ہلکی نسیم کی خوشبو کلاس روم میں پھیلی ہوئی ہے۔ سیّد رضی کا محبت آمیز چہرہ زیادہ ہشاش بشاش نظر آتا ہے اور ان کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔

وزیر کا آدمی اپنے کانپتے ہاتھوں سے سکوں کو ایک ایک کر کے تھیلی میں ڈالتا ہے۔ اس کے منہ کو کس کے باندھتا ہے اور اسی طرح کانپتے ہوئے زربفتی سرپوش کو طبق کی تھیلیوں کے اوپر ڈال دیتا ہے اور جانے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ طلبا درضی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ سیّد رضی جوان طالب علم کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر خادم مدرسہ سے کہتے ہیں:

''آج کے بعد اسٹور کی کنجی مدرسہ کے ہر ایک طالب علم کے لیے تیار کراؤ اور انہیں دے دو تا کہ اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہاں سے لے لے''۔

پھر وہاں سے شوق سے اُٹھتے ہیں اور طلبا کے حلقہ میں درخشاں نگینہ کی طرح مدرسہ کے صحن میں تشریف لاتے ہیں۔ وزیر کا آدمی پہلے کے مانند سر جھکائے ہوئے خادم کو آواز دیتا ہے اور ماتھا سکوڑ کر طبق کو اس کے سر پر رکھتا ہے اور چلا جاتا ہے[1]۔

○○

---

۱. یہ واقعہ بغداد میں رونما ہوا۔ علامہ سیّد رضی جو سیّد مرتضیٰ کے بھائی تھے۔ عراق میں شیعوں کے بزرگ علماء میں سے تھے۔ ۳۵۹ قمری میں بغداد کے کرخ کے مقام پر پیدا ہوئے اور نوجوانی میں علوم آلِ محمدؐ کے مجتہد ہوئے اور اپنے بھائی کے ساتھ درس اور علمی بحث شروع کی۔ انہوں نے 'نہج البلاغہ' لکھی۔ شاعری میں اعلیٰ رتبہ رکھتے تھے۔ سیّد رضی نے ۴۷ سال کی عمر میں ۴۰۶ قمری میں بغداد میں انتقال فرمایا اور حرم امام حسینؑ میں دفن ہوئے۔

دوستی کا قصہ

مسجد روزہ داروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے، اور آپ ورد و وظائف میں مشغول ہیں۔ لوگوں کا ہجوم شانہ بشانہ گوہر شاد کی مسجد[1] میں جگہ جگہ بیٹھا ہوا ہے اور اونچے منبر کو بغور دیکھ رہا ہے۔ حرم کا آدھا صحن زائروں سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی نگاہیں مسجد کے شبستان کے اندر کی سمت لگی ہوئی ہیں۔ حرم کی فضا میں ایک خوشی کا ماحول رقصاں نظر آ رہا ہے اور رواق کے در کے پاس بہترین خوشبودار اگربتی جل رہی ہے۔

آپ صحنِ حرم میں آتے ہیں۔ خدام کو پتہ چلتا ہے تو آپ کے لئے راستہ بناتے ہیں۔ آپ مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ وہی سادگی، وہی سادہ سی عبا و قبا اور چھوٹا سا سفید عمامہ سر پر رکھے ہوئے۔ آپ ستارہ کی مانند چمک رہے ہیں، لوگوں کو جب پتہ چلتا ہے تو راستہ دیتے ہیں اور صلوات پڑھتے ہیں۔ کچھ لوگ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، آپ کے شانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں اور بار بار صلوٰۃ کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ مگر آپ کا دل اس بات سے راضی نہیں ہے اور جس طرح بھی بن پڑتا ہے جلدی سے خود کو منبر کی طرف لے جاتے ہیں، اب مسجد میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ سامعین یہاں زیادہ تعداد میں جمع ہوئے ہیں تا کہ پھر آپ انہیں اپنی بابرکت باتوں کے تازہ گھونٹ سے سیراب کریں۔ آپ کچھ راتوں سے ماہِ رمضان کے منبر کے مہمان ہیں اور انہیں مجلس وعظ اور خطاب سے مستفید کر رہے ہیں۔ اگرچہ آپ کا بزرگ اور مشہور عالموں میں شمار ہوتا

۱۔ گوہر شاد: امام رضاؑ کے حرم کے پاس ایک بڑی مسجد۔

ہے مگر آپ کا خطاب اس قدر سادہ ہے کہ لوگ دلنشینی کے ساتھ آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

ایک زوردار صلوات مسجد کے وسیع و عریض شبستان کو ہلا دیتی ہے اور کنویں کے کبوتروں کی مانند مسجد کے منقش طاق کی سمت اٹھتی ہے۔ آپ اطمینان کے ساتھ منبر کی چھوٹی سیڑھیوں سے اوپر جاتے ہیں اور آرام سے منبر پر بیٹھ جاتے ہیں۔ لوگوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں، پھر بسم اللہ کہہ کر خطبہ اور قرآن کی آیتوں کی تلاوت شروع کرتے ہیں۔ لوگ خاموش ہیں۔

آپ کی شیریں وعظ و نصیحتیں پھول کی طرح کھلتی ہیں اور بادِ نسیم کے مانند دلوں میں جھونکے چلتے ہیں۔ اب وہی دل انگیز خاموشی صحنِ مسجد میں بھی پہونچتی ہے۔ صحن میں موجود بھی لوگوں کی نگاہیں آپ کی طرف ہیں۔ آپ پھر پیغمبرؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ کے بارے میں بتاتے ہیں، اور آپ کی آنکھیں ان کا ذکر کرتے ہی اشکبار ہو اٹھتی ہیں۔

آپ بہت ہی اطمینان سے مجلس میں بیٹھے لوگوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کے لئے اپنی باتوں کو دہراتے ہیں۔ اچانک آپ تھوڑا رُک جاتے ہیں، پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ آپ کی نگاہ مسجد کے ایک گوشہ کی طرف جاتی ہے۔

اب آپ کچھ بھی نہیں کہتے ہیں۔ لوگ تعجب سے آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ مجمع میں سے کچھ لوگ اُچک اُچک کر دیکھ رہے ہیں۔ آپ ابھی بھی خاموش ہیں اور تعجب سے اسی طرف بغور دیکھ رہے ہیں۔ کیا ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ آپ کی طرح اس شخص کو دیکھ رہے ہیں جو مسجد کے ایک گوشے میں سر جھکائے بیٹھا ہوا ذکر میں مشغول ہے۔ وہ ملا عباس تربتی[1] ہیں جو بقیہ لوگوں کی طرح آپ کی شیریں گفتگو سننے کے لیے آئے ہیں۔

۱۔ ملا عباس: مرحوم محدث قمی کی مرحوم آخوند ملا عباس تربتی سے پرانی دوستی تھی۔ آیۃ اللہ تربتی عارفان پاک اور بزرگ علماء میں سے تھے اور تربت حیدریہ میں رہتے تھے۔ بہت سی کرامتوں کے حامل تھے۔ تقویٰ اور خلوص میں زبان زدِ خلائق تھے۔ آخوند ملا عباس تربتی اس سال مشہد گئے تھے اور اگرچہ وہ خود مشہور عالم تھے لیکن چاہتے تھے کہ رمضان کے مہینہ میں حاجی شیخ عباس قمی کے بیان سے فیض حاصل کریں۔ اس آسمانی مرد کی قبر حرم امام رضاؑ کے صحن کی قبروں میں سے ایک میں ہے۔

دفعتاً آپ منبر پر پہلو بدلتے ہیں۔لوگوں کا تعجب بڑھتا جارہا ہے۔آپ منبر سے ایک زینہ نیچے اُترتے ہیں۔اپنی عبا کو اپنے شانوں پر ڈالتے ہیں اور آپ کی پرخلوص آواز بلند ہوتی ہے۔

''لوگو! اے بھائیو! اس وقت ہمارے درمیان جناب آخوند تشریف فرما ہیں۔کتنا بہتر ہے کہ آپ لوگ اس کے بعد ان سے فیض یاب ہوں''۔

ایک ہمہمہ بلند ہوتا ہے۔آپ منبر سے نیچے اُتر آتے ہیں۔لوگ آپ کے راستہ میں کھڑے ہوجاتے ہیں اور تعجب سے آپ کو دیکھتے ہیں اور آپ کو راستہ دیتے ہیں۔آپ متانت کے ساتھ ملاّ عباس کی طرف جاتے ہیں۔انہیں سلام کرتے ہیں۔ملاّ عباس اپنی جگہ سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔گھبرا کر آپ کی طرف دیکھتے ہیں۔آپ ان سے بغلگیر ہوتے ہیں پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر ادب و احترام کے ساتھ اُنہیں منبر کی جانب بلاتے ہیں۔لیکن وہ قبول نہیں کرتے ہیں۔آپ اصرار کرتے ہیں۔لوگ آپ کے ارد گرد کھڑے ہیں۔کوئی چارہ نہ دیکھ کر وہ قبول کرتے ہیں اور سر جھکائے ہوئے دھیرے دھیرے آپ کے ساتھ آتے ہیں۔جب آپ منبر کے قریب پہنچتے ہیں تو احترام کے ساتھ ان کی مدد کرتے ہیں تاکہ منبر کے پہلے زینہ پر قدم رنجہ فرمائیں۔وہ اگرچہ اس پر راضی نہیں ہیں مگر آپ کے زیادہ اصرار کے سبب منبر پر تشریف لے جاتے ہیں اور اس پر بیٹھ جاتے ہیں۔

لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔آپ بھی ملاّ عباس کے منبر کے نیچے ایک شاگرد کی مانند دوزانو بیٹھ جاتے ہیں۔ناگہاں صلوٰۃ کی بلند آواز آسمان کی بلندی تک جاپہنچتی ہے۔ملاّ عباس بسم اللہ کہتے ہیں اور ان کی مہربان آنکھوں کا نور مشتاق و منتظر لوگوں پر ضیاپاشیاں کرنے لگتا ہے۔

اس کے بعد اپنے دوست ملاّ عباس کے احترام اور ان کی حق دوستی کے اظہار کے مدنظر آپ دوبارہ منبر پر نہیں گئے اور ملاّ عباس مسجد گوہرشاد میں صاحبِ منبر ہوئے۔

ملاّ عباس بہت ہی رحم دل اور مہربان عالم ہیں اور لوگ ان کے عادی ہوگئے ہیں اور ان کی باتیں تمہارے اور ان لوگوں کے لئے ایک بڑا سبق بن جاتی ہیں۔آپ کی دوستی اور ملاّ عباس کے تئیں آپ کے احترام کا قصہ سینہ بہ سینہ مشہد میں بیان کیا جاتا ہے اور بہت جلد ہی اس کی خبر تمام حوزہ علمیہ میں پھیل جاتی ہے[1]۔

○○

۱۔ حاج شیخ عباس قمی ۱۲۹۴ قمری میں پیدا ہوئے۔بچپن سے ہی باذوق اور ہوشیار طالب علم تھے۔جلد ہی فقہ، اصول اور خاص طور سے حدیث شناسی میں بزرگ عالم ہوئے۔شیخ عباس قمی نے مفاتیح الجنان نامی اہم کتاب کو جمع کیا، اسی وجہ سے اپنا نیک اور جاودانہ نام چھوڑ گئے۔۱۳۵۹ قمری میں دُنیا سے رخصت ہوئے اور حرم امام علیؑ میں دفن ہوئے۔

سیّد صاحب بتایئے

دیارِ غیر میں عزیزوں اور خاندان والوں سے دوری بہت بڑا غم ہے اور اگر انسان خالی ہاتھ ہو اور وہ دوسروں کا محتاج ہوجائے تو غم اور زیادہ ہوجاتا ہے۔ کتنی محبت سے اپنی روشن نگاہوں کو میری نگاہ سے جوڑتے ہو۔ سیّد صاحب[1]، میں آپ کو کتنا چاہتا ہوں، آپ کے دیکھنے سے میں کبھی بھی سیر نہیں ہوا۔ یقیناً آپ منتظر ہیں کہ میں کچھ کہوں۔ بہتر ہے کہ میں اپنا مدعا آپ سے بیان کردوں۔ اگرچہ اس کے بیان کرنے سے شرم آتی ہے مگر چارہ بھی کیا ہے۔ مجھے اپنی نئی پریشانی کے بارے میں آپ سے کہہ دینا چاہیے۔ آپ سے جو مشکل کشا ہیں۔

''اس پردیس میں تنگدست ہوگیا ہوں اور اخراجات کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اخراجات زیادہ ہیں اور میں بے مایہ''۔

آپ ہمیشہ کی طرح خاموش رہتے ہیں اور فکر میں ڈوب جاتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں گویا بیتاب ہورہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے آپ کے قلبِ نازک کو آزردہ کردیا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے چپ رہنے میں کوئی راز ہے، جو شاید بعد میں کھلے۔ اس لیے میں آپ سے دوبارہ کچھ نہیں کہتا ہوں اور پھر آپ کے روشن چہرہ کو دیکھنے میں کھو جاتا ہوں۔

○

۱۔ سیّد صاحب: علامہ بحرالعلوم عراق میں شیعوں کے ایک بزرگ عالم (۱۲۱۲-۱۱۵۵ ہجری قمری)

خانۂ خدا کے طواف سے پلٹے ہیں۔ کتنے حسین ہوگئے ہیں آپ۔ ہر روز کی طرح آپ کی قبا سے کتنی اچھی خوشبو آرہی ہے۔

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ دن کے اس وقت کون ہے جو اتنا آہستہ سے دروازہ کے قلابہ کو ہلا رہا ہے۔ سیّد صاحب آپ مضطرب کیوں ہوگئے۔ کیا کچھ ہوگیا ہے۔

آپ جلدی سے دروازہ کی طرف جاتے ہیں۔ آپ کے ظریف ہاتھ کانپنے لگتے ہیں پھر بھی آپ تاخیر نہیں کرتے۔ میں نے آج تک آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ بہت ہی آہستہ سے دروازہ کی زنجیر کھینچتے ہیں اور دروازہ کھول دیتے ہیں۔ ایک بلند قامت اور نورانی چہرہ والا خوش سیما عربی شخص دروازہ کے درمیان دکھائی دیتا ہے۔ آپ اسے سلام کرتے ہیں۔ یہ شخص کون ہے، کتنی مہربانی سے آپ کی احوال پرسی کرتا ہے۔ جب سے آپ کے ساتھ ہوں میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ کس قدر خوبصورت انداز میں آپ کی طرف نگاہ کرتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں گویا بے شمار پرندے ہیں جو پرواز کررہے ہیں۔

آپ انہیں گھر کے اندر آنے کو کہتے ہیں۔ میں جلدی سے سلام کرتا ہوں۔ وہ بہت ہی پُرخلوص انداز میں میرے سلام کا جواب دیتا ہے اور ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی آواز کس قدر دلکش ہے۔ میرا دل دھڑ دھڑ کررہا ہے۔ یہ کون ہستی ہے کہ آپ اس طرح دروازہ کے کنارے اس کے روبرو دو زانو ہوکر بیٹھ گئے ہیں اور احترام سے اس کی طرف نگاہ کرتے ہیں۔ گھر میں ایک عجیب خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ میں اپنے مہمان کے چہرہ کو اچھی طرح کیوں نہیں دیکھ پارہا ہوں یہ میں نہیں جانتا۔ میری آنکھیں اس تابندہ صورت کو دیکھ پانے کی متحمل نہیں ہیں۔

ایک گھنٹہ سے آپ لوگ ایک دوسرے سے کچھ گفتگو کررہے ہیں۔ ہمارا مہمان اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی مردانہ ہیئت نے میرے دل میں ارتعاش پیدا کردیا ہے۔ آپ بعجلت تمام دروازہ کے کنارے جاتے ہیں۔ دراوزہ کھولتے ہیں پھر

اس کے ہاتھوں کو بصد شوق بوسہ دیتے ہیں۔ وہ مجھے خدا حافظ کہتا ہے اور گھر سے باہر چلا جاتا ہے۔

آپ چند دقیقہ بعد واپس آتے ہیں اور میرے روبرو کھڑے ہوجاتے ہیں۔ آپ کے چہرہ کا رنگ اُڑا اُڑا کیوں ہے؟ آپ کی محبت آمیز آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟ آخر وہ اجنبی کون تھا کہ آپ نے بہت تواضع سے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ آپ میری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہتے ہیں:

''ملّا زین العابدین[1]، کوہِ صفا[2] میں ایک صرّاف ہے، اس تحریر کو اس کے پاس لے جاؤ اور جو کچھ تمہارے سپرد کیا جائے اسے لے لو اور جتنا جلدی ہوسکے گھر لے آؤ''۔

میں اس تحریر کو آپ کے ہاتھوں سے لے لیتا ہوں۔ اس سے وہی عجیب خوشبو نکل رہی ہے۔ بے اختیار میں اسے اپنے سینہ سے لگاتا ہوں۔ میرے دل کو سکون ملتا ہے اور میں گھر سے باہر چلا جاتا ہوں۔

مردصرّاف اس تحریر کو پڑھتا ہے اسے چند بار بوسہ دیتا ہے اور اپنی نم آنکھوں سے ملتا ہے۔ آپ لوگوں کو کیا ہوا ہے۔ پروردگار! یہ کون سا راز ہے کہ میں اس سے لاعلم ہوں۔ وہ شخص بہت ہی خوش روئی سے مجھ سے کہتا ہے جاؤ چار مزدور لے کر آؤ۔

کچھ دیر بعد میں چار مزدوروں کو لے کر اس کی دُکان پر واپس آتا ہوں۔ ان مزدوروں میں سے ہر ایک کے کاندھے پر بھاری بوری رکھتا ہے۔ بوریاں سکّوں سے بھری ہیں۔ میں حیرت زدہ ہوجاتا ہوں۔ مجھے اپنی طلب کی یاد آجاتی ہے۔ یعنی یہ پیسے وہ بھی اس دیارِ غیر میں۔ سیّد صاحب آپ کے لیے ہے۔

مردصرّاف کہتا ہے:

۱۔ ملّا زین العابدین: عالم ربانی اخوند ملّا زین العابدین سلماسی جو علاّمہ بحرالعلوم کے ساتھ مکہ معظّمہ میں تھے۔

۲۔ کوہِ صفا: مکہ معظّمہ شہر کا ایک پہاڑ۔

''پیسوں کی ان بوریوں کو سیّد تک پہنچا دو''۔

میں حیران و پریشان مزدوروں کو ساتھ لیے ہوئے چل پڑتا ہوں۔

اس واقعہ کو گذرے ہوئے چند روز ہوگئے ہیں۔ میں ابھی بھی حیران ہوں۔ اس پہاڑ (کوہِ صفا) کے پاس آیا ہوں، وہاں نہ دُکان ہے اور نہ ہی وہ مردصرّاف۔ یہ تمام باتیں میرے لیے عجیب ہیں۔ میں جس سے بھی دریافت کرتا ہوں اس مردصرّاف کو کوئی نہیں جانتا۔ سیّد صاحب اس نورانی عربی مرد جس کے ہاتھوں کو آپ نے ایک فرمانبردار غلام کی طرح بوسہ دیا نیز اس دُکان اور اس مہربان مردصرّاف کی حکایت کیا ہے۔ سیّد صاحب مجھے بھی تو بتایئے[1]۔

○○

۱۔ تاریخ کے حوالہ سے وہ مردمہمان حضرت صاحب الزمانؑ تھے۔

پڑوسی کے یتیم

بیوی کا دل بیٹھ گیا۔سالوں سے سید کے ساتھ تھیں لیکن آج سے زیادہ کبھی ان کا دل نہیں دکھا تھا۔وہ سید جو اس کے لئے دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی تھے۔اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز ان کے سینہ میں دھیرے دھیرے اوپر آئی اور گلوگیر ہوگئی اور جلد ہی اس نے اسے بے چین کردیا۔اپنے آپ بڑبڑائیں۔کیوں میں نے اب تک اس کے بارے میں نہیں سوچا؟ یعنی اسی زمانے میں جب ہماری زندگی بدتر ہونے لگی اور زمانہ سخت ہوگیا۔آہ کہ سیّد کے حال و احوال اور دن کیسے ہوگئے ہیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں بتاتے ہیں۔چہرہ کیسا پژمردہ ہوگیا ہے۔

سیّد اس کے لیے مہربان اور ایک نجیب شریکِ حیات تھے۔شہر کے ایک مشہور عالم تھے۔برسوں سے اس کی زندگی کے شب و روز دوسرے بہت سے گھروں کی طرح تھے جو نانِ شبینہ کے محتاج تھے۔وہ سادہ اور فقیرانہ زندگی گزار رہے تھے،مگر اب ان کے حالات بدتر ہوگئے تھے۔اگر اچھا کھانا ہوتا بھی تو اپنے بچوں کے لیے رکھ چھوڑتے تا کہ انہیں سختی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور انہیں کوئی بیماری لاحق نہ ہو۔مگر وہ لوگ خود... افسوس... خاص طور سے سیّد کہ زیادہ تر روزہ رکھتے تھے۔

بیوی غمگین ہوگئی۔سید کی محبت آمیز مگر تھکی ہوئی آنکھوں کی خاطر۔ان کی شیریں لیکن پھیکی مسکراہٹ کی خاطر۔سیّد کچھ دنوں سے بے غذائی کے سبب کمزور ہوگئے تھے اور روز بروز ضعیف اور نحیف ہوتے جارہے تھے لیکن کوئی گلہ نہیں کیا۔

بیوی کی طاقت جاتی رہی۔خود کو دلگیر و پریشان افکار کے ہجوم سے نکالا۔فوراً ہی اپنی ماں کی قدیمی یادگار صندوق کے پاس گئی۔ایک چھوٹی سی کنجی پرانے تالے میں ڈال کر گھمایا اور صندوق کو کھولا۔پھر اس کے اندر تہہ کئے ہوئے رکھے کپڑوں کو ایک ایک کر کے الگ ہٹایا۔ایک چھوٹی سی تھیلی اس کے ہاتھ لگی۔پیسوں کے چند سکوں کی کھنکھناہٹ اس کے کانوں کو اچھی لگی۔تھیلی کے منہ کو کھولا اور سکوں کو اپنی ہتھیلی پر پھیلایا۔دنوں اور مہینوں چرخہ چلانے کی مزدوری یہی چند سکے تھے جسے بچوں اور اپنے آئندہ کے دنوں کے لیے پس انداز کر رکھا تھا۔مڑی اور چھوٹے چرخہ پر نگاہ ڈالی اور خود سے کہا:

''ہم پھر چرخہ کاتیں گے، اپنے ہاتھوں اور آنکھوں سے کام کریں گے تا کہ سیّد اچھی طرح تحصیلِ علم کریں، تا کہ ہمارے بچے اچھی طرح بڑے ہوجائیں، تا کہ ہم لوگ دوسروں کے محتاج نہ رہیں''۔

صندوق کو بند کیا۔اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سیّد کو برا لگے۔شاید... مگر نہیں، جس طرح بھی ہو انہیں قبول کرنا چاہیے۔سیّد ان دنوں کافی ضعیف ہوگئے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ شاید ہمارے درمیان سے ہی اُٹھ جائیں۔بیوی نے چادر اپنے سر پر ڈالی اور صحن خانہ کی طرف چل پڑی۔

○

مرغ کی خوشبو نے سیّد کی نظروں کو ان کے ہاتھ میں موجود کتاب سے ہٹا کر اپنی طرف کھینچا۔سیّد کے سامنے ایک چھوٹا سا دسترخوان بچھا تھا جس پر روٹی کے چند ٹکڑے، تھوڑی سبزی، پیاز اور ایک گلاس پانی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔بچوں نے ذائقہ دار کھانا پیٹ بھر کھالیا تھا اور دوسرے کمرے میں کھیل رہے تھے۔بیوی نے باورچی خانہ سے آواز دی کہ کتاب کو ایک طرف رکھئے میں کھانا لارہی ہوں۔

سیّد جو ابھی ابھی درس سے واپس آئے تھے زیادہ حیران ہوئے اور باورچی خانہ کی طرف دیکھا۔ان کے دل میں خیال آیا۔کھانا! پکے ہوئے اچھے کھانے کی خوشبو

کہاں سے آ رہی ہے۔ میرے پاس تو پیسہ نہیں ہے جو میں گھر میں دیتا۔

بیوی تانبے کی سینی لیے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئی۔ سینی کو سیّد کے قریب رکھا۔ مرغ کی خوشبو اور بھاپ تانبے کے پیالہ سے اُٹھ رہی تھی۔

بیوی مسکرائی۔ دوپہر کی ہلکی سورج کی دُھوپ کمرہ کے اندر تک پھیلی ہوئی تھی اور دیوار کی جڑ تک اُجالا تھا۔

سیّد نے خوشبودار غذا کو بغور دیکھا۔ بیوی خاموش رہی اور کچھ نہیں کہا۔ سیّد انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ حلال غذا ہے، مگر خود سے کہا:

''کیوں...، اتنا اچھا کھانا وہ بھی میرے لیے؟''

بیوی نے تفصیل بتائی۔ سیّد نے فوراً اپنا چہرہ پھول کی مانند ان کی طرف گھمایا اور ہنستے ہوئے پوچھا:

''سچ بتانا کہ یہ کھانا اس لیے تیار کیا ہے کہ تمہارا شریکِ حیات ہوں یا اس سبب سے کہ میں سادات سے ہوں''۔

بیوی نے اطمینان کی سانس لی اور بہت ہی مہربانی سے جواب دیا:

''صرف خدا کی خوشنودی کی خاطر اور کوئی نیت میری نہیں ہے۔ ان دِنوں آپ بہت ہی کمزور ہوگئے ہیں اور آپ کا چہرہ کمھلا گیا ہے۔ میں نے سوچا چرخہ کاتنے کی مختصر مزدوری سے آپ کے لیے اچھا کھانا تیار کروں''۔

سیّد کی بے تابی ختم ہوگئی۔ دھیرے سے ایک آہ کھینچی اور زیرلب دعا پڑھی۔ پھر بہت ہی خندہ پیشانی سے پوچھا کہ اجازت دیتی ہو کہ میں اس غذا کے ساتھ جو چاہوں کروں۔

بیوی حیرت میں پڑ گئی۔ اپنی سوالیہ آنکھوں کے نور کو سیّد کے چہرہ پر ڈالا اور ان کی بات کی منتظر رہی۔

''ہمارے ہمسایہ کے یتیموں کا حال کیا ہے؟''

بیوی نے دبی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا:

''اچھے ہیں''۔

پھر اُنہیں اپنے بغل والے گھر کا خیال آیا جن کا مرد کچھ سال پہلے دُنیا سے رخصت ہوگیا تھا اور اس کے بیوی بچے تکلیف میں دن کاٹ رہے تھے۔ کچھ کہنا چاہا کہ سیّد نے فوراً پوچھا:

''کیا انہوں نے ابھی تک ایسی غذا کھائی ہے؟''

بیوی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ پڑوسی کی عورت نے کہا تھا کہ کئی بار اس کے بچے رات میں بھوکے سوئے ہیں اور کھانے کے لیے گھر میں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔

''بالکل نہیں، یاد تو نہیں آتا''۔

سیّد کی پیشانی اور پسینہ پسینہ ہوجاتی ہے۔ بیوی نے محسوس کیا کہ سیّد کا حال دگرگوں ہوگیا ہے اور ان کے چہرہ کا زرد رنگ زیادہ واضح ہوگیا ہے۔ پانی کا پیالہ ان کے قریب لے جانا چاہا تاکہ ایک گھونٹ پانی پی کر اُنہیں آرام ہوجائے مگر سیّد نے کانپتی اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا:

''ہماری اور تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ وہ لوگ اس تازہ غذا کو کھائیں تاکہ خدا خوش ہوجائے''۔

پھر تانبہ کے پیالہ کو سینی میں آہستہ سے رکھا اور اسے بیوی کے قریب لے آئے۔ بیوی نے سینی کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھایا اور مسکرائی۔ سیّد نے روٹی کے ایک ٹکڑے کو دسترخوان سے اُٹھایا اور بیوی کو دروازہ تک چھوڑا۔ بیوی نے محسوس کیا کہ سیّد[1] کے چہرہ پر کمزوری اور پژمردگی کا کوئی اثر دِکھائی نہیں دیتا ہے۔ پس بصد شوق پڑوسی کے گھر گئی۔

○○

۱۔ سیّد: عالم عالی قدر آیۃ اللہ سیّد محسن حسینی معروف بہ محقق المرجی عراق میں ایک بزرگ عالم ہوئے ہیں۔ وہ علامہ حلّی کی بہن کے لڑکے ہیں۔ ۶۸۱ ہجری قمری میں عراق کے حلّہ نامی مقام میں پیدا ہوئے اور ۷۵۲ یا ۷۵۴ ہجری قمری میں بغداد میں انتقال فرمایا۔ وہ صاحبِ فتویٰ تھے اور اہم کتابیں لکھی تھیں۔

چاندی جیسے انجیر کے درخت کے نیچے

وہی تھا۔ایک ہفتہ پہلے والی وضع قطع کے ساتھ، یہاں تک کہ اپنی پگڑی کو بھی اپنے سر پر اسی عجیب وغریب شکل سے باندھ رکھا تھا۔یعنی اسے دوچار بار گھما کر اپنے سر پر لپیٹ رکھی تھی اور تحت الحنک کو ٹھوڑی کے نیچے سے گھما کر سر پر ڈال رکھا تھا پھر اس کا سرا،سر کے پیچھے لٹکا رکھا تھا۔اس کا لباس نجف والوں کے عربی پیراہن سے میل نہیں کھاتا تھا۔لمبا، ڈھیلا ڈھالا اور میلا کچیلا تھا۔

علاّمہ غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔اس بیابانی عرب کے چہرہ پر گویا گرمی کے موسم کی تیز دُھوپ نے جھریاں ڈال دی تھیں۔جھریاں اس قدر زیادہ اور سخت تھیں کہ اُنہیں گنا نہیں جاسکتا تھا۔اس کے ہاتھ سوکھے اور کھردرے تھے۔اس کی ہلکی بھوری آنکھیں نوکیلے چوڑے ابرو کے نیچے سے بڑی مشکل سے نظر آتی تھیں۔

علاّمہ[1] نے دل ہی دل میں سوچا یہ وہی پچھلے ہفتہ والا آدمی ہے۔یہ وہی عرب بیابانی ہے جو اپنی دودھ دینے والی گائے کے اچھا ہونے کے لیے حرم میں آیا تھا۔علاّمہ نے سر اُٹھایا اور وردو وظائف کی اپنی چھوٹی سی کتاب کو کھولا اور کچھ ورق پلٹنے کے بعد زیارتِ امین اللہ والا صفحہ کھولا۔پڑھنا چاہا کہ اس عرب مرد کی آواز سنائی دی۔

۱۔ علامہ: مرحوم آیۃ اللہ حاج شیخ عبدالحسین تبریزی نجفی معروف بہ علامہ امینی ۱۳۲۰ قمری تبریز میں پیدا ہوئے۔بچپن سے ہی شائستہ اور ممتاز انسان تھے۔دینی علوم پہلے اپنے وطن پھر نجف اشرف میں حاصل کیا۔ان کے اساتذہ میں بزرگ ہستیاں جیسے میرزائی نائینی اور سیّدابوالحسن اصفہانی تھیں۔

''اے امیرِ مومنان، اے شیعوں کے مولا! میں ہوں...آپ پر سلام''۔

علاّمہ کی خوشحال نظریں دوبارہ اس کی طرف اُٹھ گئیں۔کچھ دوسرے لوگ بھی جو ضریحِ امام علیؑ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اسے دیکھنے لگے۔

ہوا گرم تھی۔گرمی کے موسم کی جلا دینے والی تپتی لُو حرم کے دروازہ کے باہر سے ضریح کی طرف آرہی تھی۔اگر دو تین ہاتھ کے پنکھے اور چھت کے پنکھے نہ ہوتے تو حرم کے زائرین بے چین ہوجاتے۔

اس عربی مرد کی آواز بہت ہی تیز اور بھدّی تھی۔

''اے امیرِ مومنان! کیا آپ مجھے جواب دیں گے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اور تیز آواز میں اپنی بات کہوں؟''

اس کے اس طرح سے چلاّنے پر ایک آدمی نے جو اس کے قریب تھا اپنی کلمہ والی انگلی کو اپنی ناک پر رکھا اور کہا:

''آرام سے''۔

عربی مرد نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سینہ پر رکھا اور کہا:

''ٹھیک ہے''۔

علاّمہ کے ہونٹ زیارتِ امین اللہ پڑھنے کے لیے ابھی حرکت میں آئے ہی تھے کہ عربی مرد نے دوبارہ چیخ چیخ کر بڑی کرخت آواز میں کہنا شروع کیا:

''میں...آپ کا ممنون ہوں۔میں بے پناہ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری مادہ گائے اچھی ہوگئی ہے''۔

علاّمہ کو تعجب ہوا۔وہ عرب ایک ہفتہ قبل ایسی ہی ایک شب جمعہ میں رونا پیٹتا آیا اور ضریح کے قریب کھڑا ہوگیا۔پھر رونے لگا اور زور زور سے گڑگڑا کر کہا:

''آقا! میری مدد کیجیے۔میری اور میرے خانوادہ کی کل پونجی برباد ہوا چاہتی ہے''۔

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اس کی تیز آواز کی مانند بہہ رہے تھے اور داڑھی کا ایک ایک بال بھیگ گیا تھا۔

علاّمہ کی آنکھیں گویا بے نور ہوگئی تھیں۔ عجیب بات انہوں نے سنی۔ پلٹے اور ضریح پر نظریں ٹکا دیں۔ اس کے قریب سے اچھی خوشبو محسوس کر رہے تھے۔ ان کے دل میں ایک طوفان اُٹھنے لگا۔ دُعا کی کتاب کو بند کیا، اُٹھ کھڑے ہوئے اور قریب گئے۔ حرم کی چاندی والی ضریح کو ہاتھوں سے پکڑا۔ آنسوؤں نے مہلت نہ دی اور موتی کی طرح ان کی روشن اور جذاب آنکھوں سے ان کے پھولے ہوئے رخسار پر گرنے لگے۔

علاّمہ کے شانوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ مردِ عربی کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ علاّمہ نے غمگین ہو کر کہا:

''آقا، آپ نے اس دیہاتی کی حاجت روائی فرما دی، مگر میں نے ایک مدّت سے آپ کو خدا کے نزدیک شفیع قرار دیا ہے اور آپ سے توسّل چاہا ہے کہ آپ مجھے اس نایاب کتاب کے حصول میں مدد فرمائیں، مگر...''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ضریح کے اندر سے ایک تازہ نوران کی نم آنکھوں میں در آیا۔

''کئی ہفتہ ہو گئے کہ مجھے وہ کتاب نہیں مل پائی، مگر اس آدمی کو ایک ہفتہ کے اندر اپنی حاجت مل گئی۔ میں یہ کتاب اپنے لیے چاہتا ہوں یا آپ کی کتاب الغدیر کے لیے؟''

○

ہوا نے خاموشی سے کمرہ کی کھڑکی پر دستک دی۔ ہر رات کی طرح انجیر کے درخت کے شاخوں میں جھینگر گا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ چاندنی میں انجیر رو پہلی صورت کا ہو گیا ہے۔ علاّمہ کی آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی تھی۔ اِس پہلو اُس پہلو جس

قدر بھی کروٹ بدلی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان کے ذہن میں اس عرب کا چہرہ اُبھر آیا۔

''آقا ممنون ہوں۔ بہت زیادہ ممنون۔ میں پھر آپ کے گھر آؤں گا!''

علاّمہ کی آنکھیں تازہ آنسوؤں سے دُھندلا گئیں۔ اُٹھے اور آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ باریک چاند کھڑکی کے عقب سے بلند ہو رہا تھا۔ گویا ہنس رہا تھا اور علاّمہ کی طرف کوئی دھیان نہیں دے رہا تھا۔ علاّمہ اپنے بستر پر بیٹھ گئے۔ بستر کے کنارے رکھے ہوئے گلاس کو اُٹھایا، تھوڑا سا پانی اس میں سے پیا اور کہا:

''حسینؑ آپ پر سلام''۔

پھر لیٹ گئے اور سوچنے لگے۔

''نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے مولا مجھے جواب نہ دیں۔ مگر آخر اتنی دیر کیوں''۔

اپنا بستر بچھانے سے پہلے انہوں نے نہ کھانا کھایا نہ کوئی کتاب کھول کر پڑھی۔ صرف دُعا پڑھی اور بار بار کروٹیں بدلتے رہے۔ چاند ابھی بھی ہنس رہا تھا۔ خوش وخرم جھینگروں کی آواز زور زور سے آ رہی تھی۔

○

شیخ عبدالحسین، امینی صاحب۔

آسمان سے اس قدر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی کہ علاّمہ دو تین قدم کے فاصلے کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ پلٹے اور پیچھے کی طرف دیکھنے لگے۔

''پریشان کیوں ہے؟''

پھولوں کے اس پار سے غیر مرئی ارتعاش کی طرح ایک آواز انہیں سنائی دی۔ علاّمہ نے اپنی جوانی کے دنوں کی طرح بڑی تیزی سے اور بے قراری سے آواز کی طرف قدم بڑھایا۔ ستاروں سے بھرے پردے سے گزرے۔ ایک نورانی مرد کو دیکھا کہ ایک بڑے سبز رنگ کے تخت پر بیٹھے ہیں اور تخت میں جگہ جگہ پر زمرد، ہیرے اور

یاقوت چمک رہے ہیں۔

کسی نے ان کے دل میں کہا کہ وہ تمہارے امام امیر المومنین ہیں۔ رفتار دھیلی پڑ گئی اور زبان کلام کرنے سے قاصر۔

''آ قا...قا...مو...لا...''

''آ قای امینی خوش آمدید''۔

گلا رُندھ گیا۔ اور ایسا گریہ طاری ہوا کہ ان کے جسم کے چاروں ستون نالہ وفریاد کرنے لگے۔

''اس دیہاتی آدمی کا ایمان کمزور تھا اور اس میں اتنا صبر نہیں تھا کہ اس کی حاجت روائی میں تاخیر کی جاتی ۔۔لیکن تم...''

امام کے چہرہ کو اچھی طرح دیکھنا چاہا، مگر...

ہوا کا جھونکا کھڑکی سے ٹکرایا اور وہ خواب سے جاگے۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک عجیب خوشی سے دل لبریز تھا۔ مولا کی زیارت کی گرمی کا احساس ابھی بھی ان کے دل میں موجود تھا۔ اُٹھ کھڑے ہوئے مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ گھر کے قدیمی ایوان کی طرف چل پڑے۔ صحن میں قدم رکھا۔ مہینہ کے آخر کا باریک چاند آسمان کے بائیں طرف جا چکا تھا۔ ہاتھ بڑھایا اور ایک چاندی جیسی انجیر کو توڑا۔

خود سے کہا:

''دیکھا شیخ عبدالحسین، تم نے بے صبری کی۔ مگر یہ شیریں خواب اس بات کی بشارت ہے کہ تمہاری مشکل جلد ہی حل ہو جائے گی''۔

بیوی نے دسترخوان بچھایا اور کچھ روٹیاں اس پر رکھیں۔ دستک ہوئی۔ گھر میں پلا مرغ ککڑوکوں کرتا ہوا دَروازے کو تکنے لگا۔ اتنی صبح کون ہوسکتا ہے۔ علاّمہ نہ چاہتے ہوئے بولے:

''میں کھولتا ہوں''۔

جلدی سے دروازہ کی طرف گئے۔

''آ رہا ہوں بھائی''۔

''میں ہوں، مستری''۔

علاّمہ نے تعجب سے دروازہ کھولا۔ مستری انہی کے محلّہ کا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے علاّمہ کو سلام کیا، اور احوال پرسی کی۔ گویا اسے جلدی تھی۔ اپنا جملہ جلدی جلدی اور چبا چبا کے ادا کر رہا تھا۔ علاّمہ نے اس سے کہا کہ اندر آیئے، مگر مستری نے قبول نہیں کیا۔ اس نے ایک ضخیم اور بڑی سی کتاب علاّمہ کے حوالہ کی اور اسی عجلت سے کہا:

''میں نے اپنے موجودہ گھر سے بڑا ایک گھر خریدا ہے۔ اپنا زیادہ تر سامان وہاں منتقل کر چکا ہوں۔ مال واسباب کی نقلِ مکانی کے درمیان میں نے یہ کتاب سامان سے بھری الماری میں رکھی پائی''۔

علاّمہ نے کتاب کو اچھی طرح دیکھا۔ آنکھوں میں چمک اور کشادگی پیدا ہوگئی۔ مستری علاّمہ کی اچانک بدلی ہوئی کیفیت سے متعجب ہوا، مگر اسی لب ولہجہ میں دوبارہ کہا:

''میری زوجہ نے کہا کہ یہ کتاب نہ تو تجھے کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ تو اس لائق ہے کہ اسے پڑھ سکے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسے شیخ عبدالحسین امینی کو ہدیہ کردو''۔

علاّمہ نے اپنی آستین سے اس کتاب کی دھول کو صاف کیا، پھر دھڑکتے دل سے اس کی ورق گردانی کی۔ یہ وہی نایاب کتاب تھی۔ ان کے دل میں ایک شور وہیجان پیدا ہوا۔ کتاب کو بوسہ دیا۔ آسمان کی طرف سر کو بلند کیا۔

''پروردگار تیرا ہزار ہا شکر!''

مستری نے حیران ہوکر پوچھا:

''جناب کیا ہوا؟''

علاّمہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور انجیر کے درخت کی طرف چل پڑے۔ انجیر کے چند دانے توڑے اور اسے حوض میں دھویا۔ انجیر اُن کی نگاہ میں گویا اسی نقرئی رنگ کی مانند چمک رہی تھی۔ مستری کو درخت کے نیچے بٹھایا اور کہا:

''میں کافی دِنوں سے اس کتاب کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ مجھے ابھی اسی وقت اسی جگہ اسے پڑھنا چاہئے''۔

○○

اُس رات جو کچھ گذرا

کمرے کے شیشہ پر اس کی انگلی کی کھٹ کھٹ سے میں سمجھ گیا کہ کوئی شرمیلا اور بے زبان شخص ہے۔ انتہائی آرام اور سکون کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس نے کئی بار شیشہ پر دستک دی اور منتظر رہا کہ میں اسے جواب دوں۔

بعض جلد باز کلاس فیلو کی طرح نہیں تھا کہ فوراً اور بغیر اجازت کے دروازے کو پورا کھول دے اور اندر جھانک کر کہے کہاں ہو پڑوسی۔

میں اپنے اکیلے پن سے تنگ آ گیا تھا۔ میرا کمرہ اُجڑا ہوا اور بے ترتیب تھا۔ کمرہ میں کتابیں تھیں۔ کچھ سامان اور کھانے پینے کی چیزیں بھی وہیں پر پڑی ہوئی تھیں۔

بے زاری سے دروازہ کی طرف گیا۔ شیشہ میں سے اس کے چہرہ کو دیکھا، جوان آدمی نہیں تھا۔ متناسب داڑھی، بھرے بھرے کشیدہ ابرو، مضبوط، برجستہ اور بشاش بڑی بڑی باہر کو نکلی ہوئی آنکھوں والا ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ ابھی میں نے دروازہ کھولا بھی نہیں تھا کہ اس نے سلام کے لیے سر کو ہلایا۔ چھوٹا سا عمامہ سلیقہ سے سر پر تھا، یعنی اسے مجھ سے کیا کام تھا۔ دروازہ کھولا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو قریب لایا۔ خوش روئی اور سنجیدگی سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور فوراً اس کے سلام کا جواب دیا، اور اس کے نازک ہونٹوں کی طرف متوجہ ہوا کہ اس کی بات سنوں۔ انتہائی اطمینان سے اور ٹھیر ٹھیر کر بات کر رہا تھا۔ دلنشیں اور جذاب چہرہ۔ چال ڈھال اور وضع قطع بھی انتہائی سادہ تھا۔ ایک لحظہ کے لیے میری نظر اس کی عبا کے پیوند پر پڑی۔ اس کے بعد

میں نے اس کے جوتوں پر نگاہ ڈالی کہ بالکل ہی خراب اور بدرنگ ہو چلا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید فقیر طالب علم ہے جو دوسروں کی نظروں سے بچ کر بھیک مانگ رہا ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کے کچھ کہنے سے پہلے کمرہ میں جاؤں اور خرما کے چند دانے دوپہر کی بچی ہوئی روٹی میں رکھ کر اسے لاکر دے دوں۔ مگر احوال پرسی کے بعد فوراً ہی اس نے کہا:

''برادر، میں نے سنا ہے کہ تم تنہا ہو۔ تم کو رفیقِ حجرہ (روم پارٹنر) تو نہیں چاہیے''۔

پھر اسی مضبوط اور بشاش آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں پس و پیش میں تھا کہ کیا کہوں۔ اکیلا تھا اور مجھے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ مگر ایسا طالب علم نہیں چاہیے تھا جو مجھ سے عمر میں بڑا اور فقیروں جیسا لباس پہنے ہوئے ہو۔ یقیناً اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ تمام درد و رنج کے ساتھ وہ کمرہ میں آ رہا تھا اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میری پڑھائی رہ جائے اور اس کی بدنصیبی کا جوڑی دار ہو جاؤں۔

میں نے مدرسہ کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ عصر کا سناٹا تھا۔ موسم خزاں کا سورج خیالوں میں غرق بوڑھے آدمی کی طرح مدرسہ کی دیوار کے کنارے پر ٹھہرا ہوا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ مدرسہ کے کاج و چنار کے پیلے پیلے درخت جو ایک بڑے پانی کے حوض کے چاروں طرف تھے ایسا لگ رہا تھا گویا جھومنے اور کھڑے ہونے سے تھک گئے تھے۔

مدرسہ میں ہر کمرہ ایک طالب علم کے لیے مخصوص تھا اور میں نہیں جانتا کہ ان تمام کمروں میں وہ کیونکر میرے کمرہ تک آیا تھا۔

وہ اسی طرح منتظر تھا اور میں تذبذب کا شکار۔ وہ ابھی بھی متبسم تھا اور میں بیحد سنجیدہ۔ میں نے دوبارہ اس کی وضع قطع کا جائزہ لیا۔ اس کی عبا اور قبا پر نگاہ ڈالی۔ اس نے مجھ سے نظریں چرائیں اور سر کو جھکالیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ شاید وہ دوسرے کمرہ کا

رُخ کر لے۔ میں ابھی تک بات کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے فوراً ہی اپنا بے ترتیب اور اُجڑا کمرہ یاد آ گیا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا:

''اگر کوئی ایسا ہو جو میرے کمرہ کی صفائی ستھرائی کر دے تو مجھے کوئی حرج نہیں کیونکہ میرا زیادہ تر وقت درس میں گذر جاتا ہے اور بہت کم اپنے کمرہ میں رہ پاتا ہوں''۔

اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر خوشی کی ایک لکیر نمایاں ہوئی۔ وہ قریب آیا اور فوراً ہی کہا:

''دل و جان سے بھائی! مجھے منظور ہے''۔

میں حیرت سے اس کے سراپا کو دیکھ رہا تھا اور تھوڑا سا خود سے اور اپنی بات سے نفرت ہونے لگی، کیونکہ وہ مجھ سے بڑا تھا، اور اس کو میرے کمرہ کی صفائی ستھرائی کا کام اکیلے انجام دینا پڑے گا۔ لیکن فوراً ہی میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ کمرہ میرے قبضہ و اختیار میں ہے۔ میں نے اس کام کے بدلے اسے جگہ دی ہے جو غریب اور شاید کمزور طالب علم ہے۔

میں نے پردہ ہٹایا۔ اس نے اپنے جوتے اُتارے اور کمرہ میں داخل ہوا۔ وہ اپنے ہمراہ ایک اچھی خوشبو لیے ہوئے تھا۔ نہیں معلوم کہ یہ خوشبو اس کی اپنی تھی یا باہر سے آ رہی تھی۔ ایک انجانی خوشبو جو ایک نہ دیکھنے والے پرندے کی طرح کمرے میں پرواز کر رہی تھی۔ میں اپنی کتابوں کے پاس گیا اور اپنی چھوٹی سی میز کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑا جھینپا جھینپا سا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے عمامہ، عبا اور قبا کو کمرہ کے سامنے ایک کونے میں رکھ دیا۔ پھر بیٹھ گیا اور کچھ کتابیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا ایک گوشہ میں رکھ دیں۔

میں نے اسے سمجھایا کہ وہ اپنے لیے کمبل اور پلیٹ لے آئے۔ اس کے بعد میں نے کمرہ کے نیچے کی جانب بنی الماری پر رکھے ہوئے ایک چھوٹے سے جھاڑو کو اُٹھایا۔

اس کی تیز نگاہ کی طرف دیکھے بغیر میں نے کہا:

''اے شیخ! تھکن مٹانے کے بعد کمرے کو مرتب کردیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے''۔

وہ مسکرایا اور فوراً کھڑا ہوگیا۔ مجھ سے جھاڑو لیا اور کام میں لگ گیا۔

○

چند روز گزر گئے۔ شیخ خود کو مجھ سے اور زیادہ قریب کر رہا تھا۔ اس کی محبتیں زیادہ ہوگئیں۔ وہ میرے ہر کام میں میری مدد کرنے لگا لیکن میں سنجیدہ بنا رہا۔ اس بات کی کوشش کی کہ ایک حد سے زیادہ اس کے قریب نہ جاؤں اور ہمارے اس کے درمیان فاصلہ بنا رہے۔ شیخ نے کمرے کو گلدستہ کی طرح پررونق بنادیا تھا یہاں تک کہ کتابوں کو بھی ترتیب وار خانوں میں رکھ دیا تھا اور ان پر نمبر بھی ڈال دیئے تھے۔ دو روز کے لیے جب میں شہر سے باہر گیا، تو کمرے کے پردہ اور فرش کو باہر نکال کر مدرسہ کے صحن میں لے گیا تھا اور اسے اچھی طرح دھوڈالا تھا۔ مختصر یہ کہ کچھ دنوں بعد در و دیوار کو پھول کی طرح چمکا دیا تھا اور کمرے کی دیواروں کو صاف کردیا تھا۔ میری توقع سے کہیں زیادہ اس نے میرے کمرے کی دیکھ بھال کی۔ میں نے کئی بار رُوکھے پھیکے انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اپنے برتاؤ کو اس طرح توجیہ کیا کہ مجھے ڈھیل نہیں دینی چاہئے ورنہ وہ کمرے کا مالک بن بیٹھے گا۔ اور اگر وہ یہ جان جائے کہ میں درس و بحث میں اسی کی طرح کمزور ہوں تو پھر۔۔۔ وہ ہمیشہ کتاب پڑھتا رہتا تھا اور برابر اپنے سر اور بلند پیشانی کو ہلاتا رہتا تھا اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو جگائے رکھتا تھا، میں سوچتا تھا کہ پھر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے، اور پڑھائی میں مجھ سے کمزور ہے، اسی لئے جب دیکھو وقت بے وقت پڑھتا رہتا ہے۔

ایک بار رات کی بحث کے بعد واپس ہوا۔ بہت تھکا ہوا اور الجھا ہوا تھا۔ استاد کی تازہ بحث میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اور بہت کچھ پڑھنے کے بعد سمجھنے سے قاصر رہا

تھا۔ میرے ساتھ بحث کرنے والا طالب علم مجھ سے پریشان تھا اور مجھ سے الگ ہونا چاہتا تھا۔ مدرسہ میں کوئی نہ تھا جس کے پاس جاؤں اور درس کی وہ عبارتیں جو سمجھ میں نہیں آتی ہیں اس سے پوچھوں۔ میں نے اداسی کے ساتھ کمرہ میں قدم رکھا۔ شیخ ہمیشہ کی طرح میرے استقبال کو آیا اور خوش خوش سلام کرنے میں مجھ سے سبقت لے گیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ اپنے بستر پر جا کر دم لیا اور اپنی کمر کو تکیہ پشتی سے ٹکا دیا۔

شیخ کو قدرے تعجب ہوا مگر دوبارہ اپنے سر کو اپنی بڑی سی کتاب پر جھکالیا جس کے چمکدار حروف شاید اسے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

کچھ گھنٹے گذرے تھے یہاں تک کہ شیخ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ دعائے خواب پڑھی اور آنکھیں بند کرلیں۔ جانتا تھا کیوں... اس لیے کہ نمازِ شب کے لیے جلدی اُٹھ سکے۔ مجھے کچھ دن پہلے یہ بات معلوم ہوئی۔ ہر روز صبح کی اذان کے قریب یہی معمول تھا۔ بہت ہی اطمینان سے اُٹھ جاتا، مدرسہ کے صحن میں جا کر، وضو کرتا اور آہستہ سے کمرہ میں آتا اور آواز کیے بغیر نمازِ شب، راز و نیاز اور گریہ و زاری کے لیے کھڑا ہوجاتا تھا۔

میں نے اپنا چھوٹا سا لیمپ روشن کیا اور درس کی عبارتوں میں کھو ہوگیا۔ یہ طے پایا تھا کہ کل طلبا اُستاد کے بتائے ہوئے درس کو عربی عبارت کے مطابق بیان کریں گے۔ میں نے جس قدر بھی اپنے دماغ پر زور دیا مگر بات نہیں بنی، یہاں تک کہ عربی کا ایک جملہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شیخ غالباً اس وقت سو رہے تھے۔ چاند دروازہ کے شیشہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ مدرسہ کے صحن میں ہو کا عالم تھا۔ بھیانک سناٹا سپاہی کی طرح پہرہ دے رہا تھا۔

میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور بے اختیار پہلے جملہ کو دہرایا۔ غصے سے اور بلند آواز میں۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ دوبارہ شروع سے پڑھا، کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر پڑھا، تھکاوٹ پیدا ہوئی اور غصہ آیا، بے زاری سے کتاب کو جلدی سے بند کردیا۔

اچانک شیخ نے کروٹ بدلی۔ میں نے انہیں گھورا۔ شیخ اٹھے اور میرے سامنے بیٹھ گئے۔انہوں نے اسی ہمیشہ والے تبسم کے ساتھ کہا:

''آج رات تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ ابھی تک پڑھ رہے ہو۔ سوتے کیوں نہیں ہو؟''

میں پہلے سے زیادہ چڑچڑا ہوگیا۔ اب وہ میرے جاگنے میں بھی دخل اندازی کررہے ہیں۔میری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور کہا:

''آپ جایئے میٹھی نیند سوجایئے۔ میں خود اپنے حالات کو بہتر جانتا ہوں''۔

شیخ کے چہرہ پر کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرا، اپنا کمبل ہٹایا، سر پر پڑی سفید ٹوپی کو صحیح کیا اور چارزانو بیٹھ کر لطف ومہربانی سے کہا:

''تم نے جو عبارت پڑھی وہ میں نے سن لی۔وہ عبارت فلاں کتاب کے ۱۵۱ویں صفحہ پر ہے''۔

میں نے کمرہ کی دودھیا روشنی میں کتاب کو بڑے اطمینان سے کھولا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں حیرت واستعجاب کے سبب دوہرا ہوگیا۔لیکن چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔بمشکل تمام زبان کو حرکت دی اور پوچھا:

''تو کیا؟''

شیخ نے اسی شیریں زبانی سے کہا:

''تم نے عبارتوں کو غلط پڑھا ہے، اور اتفاق کی بات تو یہ ہے کہ وہ موضوع آسان اور شیریں ہے۔ فقط افسوس اس کا ہے کہ تمہارے استاد نے یقیناً ٹھیک سے تمہیں ذہن نشیں نہیں کرایا ہے''۔

میں ہکابکا رہ گیا۔سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح کا ردِّعمل ظاہر کروں۔ یقیناً شیخ معمولی آدمی نہ تھا۔شیخ نے جملوں کو زبانی دُہرانا شروع کیا۔ میں نے بھی آنکھوں سے ان جملوں کو پڑھنا شروع کیا۔کتنا عجیب تھا، کتاب کی عبارت کے مشابہ جملے ادا کررہا

تھا۔بالکل درست اور صحیح۔

میں نے خود کو پرسکون ظاہر کیا۔بمشکل تمام اپنے چہرہ پر پھیکی سی مسکراہٹ پیدا کی۔میرا ہاتھ چراغ کے نیچے کی جانب گیا اور بے اختیار چراغ کی لو تیز کردی۔شیخ کی آنکھوں نے ہمیشہ سے زیادہ دوستانہ انداز کا مظاہرہ کیا۔میرے قریب آئے اور ہمیشہ سے زیادہ مہربان انداز میں میرے شانہ پر ہاتھ رکھا اور پھر درس کو سمجھانا شروع کردیا۔

ایسا لگتا تھا گویا جان ہاتھ سے نکلی جارہی ہے۔کیا بیان تھا، گویا تمام بحث موم کی مانند اس کے ہاتھ میں تھی۔شکر کی طرح حلاوت اس کے ہونٹوں سے جھڑ رہی تھی۔اس کی باتوں کی نسیم جانفزا میرے نخلِ تھوڑات کی شاخوں کو لوریاں دے رہی تھی۔ میں پریشان ہورہا تھا، اس کے دلنواز بیان سے نہیں بلکہ اپنی کج خلقی اور بے رُخی کی وجہ سے، جو میں نے اس وقت اس سے کی تھی۔ وہ ہمارے بڑے استاد سے بھی بڑا تھا۔مختلف علوم میں ماہر معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ کبھی کبھی بحث موضوع سے ہٹ جاتی تھی اور وہ دوسرے علوم کے بارے میں بات کرنے لگتا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ بلاشبہ وہ ایک بڑے پایہ کا فلسفی ہے۔دل چاہا کہ اسی وقت اس کے سامنے بیٹھ جاؤں اور اپنے سر کو پیٹوں اور خاک میں لوٹنے لگوں اور کہوں میرے سر پر خاک، یہ کون سا عمل تھا جو میں نے تمہارے ساتھ روا رکھا۔تم آخر ہو کون؟

مگر میں حیران و پریشان ہورہا تھا۔میری آنکھیں جل رہی تھیں، چاہا کہ کھڑا ہوجاؤں اور مدرسہ کے سرد و تاریک صحن میں جاکر ستاروں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھوں جو دروازہ کے پیچھے سے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بھوکا کسی سخی و کرم کو دیکھے۔ میں حیران و عاجز تھا۔اس بار درس اچھی طرح مجھے یاد ہوگیا تھا۔خدا نے مجھے کیسی توفیق عنایت فرمائی تھی کہ اپنا ایک خاص استاد میرے پاس موجود تھا کہ جس نے احسن طریقہ سے میرے درس کو مجھے ازبر کرادیا۔ایک ایسا استاد تھا جو کامل اور گمنام تھا۔ میں نے دوبارہ حجاب آلود نظروں سے اسے دیکھا۔اس کی آنکھوں کا رنگ مہتابی ہورہا تھا۔ میٹھے پانی

کی طرح خوش رنگ مطمئن اور مسرور۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُٹھ کھڑا ہوا تا کہ کمرہ سے باہر چلا جاؤں اور دل کو کچھ اطمینان ہو۔

''میں آپ کے شیریں درس کا شکر گزار ہوں، آپ ایک بزرگ استاد ہیں''۔

شیخ میرے شانہ بشانہ کھڑے ہو گئے اور ہنسے۔ مجھے سینہ سے لگایا اور میری نم آنکھوں کو اپنے سینہ میں چھپالیا۔ پدری شفقت سے میرے ہاتھ کو دبایا اور کہا:

''آج کے بعد سے میں درس میں بھی دوسرے کاموں کی طرح تمہارا خادم رہوں گا''۔

میرا دِل بیٹھنے لگا۔ گھبراہٹ ہونے لگی۔ بالآخر بیٹھ گیا۔ طاقتِ گویائی جاتی رہی تھی۔ شیخ نے کہا:

''اب آرام سے سوجاؤ تا کہ کل صبح درس کے لیے مطمئن اور تازہ دَم رہو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ آج کی رات کی باتوں کو بھول جاؤ گے اور کسی سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔ میں اسی قول و قرار کے مطابق تمہارے حجرہ کا وہی خادم رہوں گا۔ وعدہ کرو''۔

میرے سینے میں ایک جلن پیدا ہوگئی تھی۔ سانس لینے کی بھی توانائی نہ تھی۔ بے چینی سے لیٹ گیا اور سر پر کمبل ڈال لیا۔

○

اُس دن کے بعد سے وہ میرا اُستاد ہوگیا اور میں اس کا شاگرد۔ درسی مباحث میں آسانی پیدا ہونے لگی۔ میرے سبق اچھے ہو گئے۔ میں نے امکانی کوشش کی کہ اسے کمرے کی صفائی ستھرائی سے روکوں۔ مگر ایسا نہیں کر سکا۔۔ جیسے ہی میری نظروں سے کمرہ دُور اور اوجھل ہوتا وہ اسے اچھی طرح صاف ستھرا کر دیتا اور میں خجالت کشیدہ، شرم سے پانی پانی اپنے خول میں سمٹ جاتا۔

ایک دن میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ کلاس میں گیا اور اس واقعہ کو استاد اور

شاگردوں سے بیان کیا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے رئیس مدرسہ کو خبر کی اور ہم سب شیخ کو دیکھنے کے لیے گئے جو مدرسہ کے کتاب خانہ میں تھا۔ وہ تمام شاگردوں، اساتذہ اور رئیس مدرسہ جو سب سے آگے تھے ان سب کو دیکھ کر چونک گئے۔ اب تو یہ کام ہونا ہی تھا کہ طلبا ان کو پہچانتے جو تہران اور اس مدرسہ میں اجنبی تھے۔

استاد اور رئیس مدرسہ نے اس روزان سے بحث و مباحثہ کیا اور آخر میں ایک بندہ کی طرح ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ بالآخر ان لوگوں کے کافی اصرار کے بعد یہ طے پایا کہ شیخ مدرسہ میں کچھ اہم ترین درس کو پڑھائیں۔ شیخ نے کافی اصرار کے بعد اسے قبول کیا۔ باوجودی کہ مدرسہ میں شیخ کے لیے اساتذہ کا کمرہ فراہم تھا لیکن کبھی بھی انہوں نے میرے چھوٹے سے کمرہ سے اپنے دل کو نہیں موڑا اور رات میں مجھے درس دینے سے ہاتھ نہیں اُٹھایا۔

○○

۱۔ وہ گمنام طالب علم آیۃ اللہ حاج شیخ ہادی نجم آبادی تھے، جو ۱۲۵۰ شمسی میں پیدا ہوئے اور بہت جلد ہی اسلامی درس میں استاد ہو گئے اور درجۂ اجتہاد پر فائز ہوئے۔ انہیں فکری مشروطیت کی پیدائش میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ آخر کار ۱۳۲۰ شمسی میں تہران میں رحلت فرمائی۔

بوری جس سے نرگس کے پھول کی خوشبو آتی تھی

ان لوگوں کو دیکھ کر سچ تو یہ ہے کہ مجھے پہلے گھبراہٹ ہوئی۔ میری نظریں ان بے چین مرد اور عورتوں کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ میں نے خود کو سنبھالا اور ان کی طرف قدم بڑھایا۔ کیا دیکھ رہی تھی کہ یہ تمام مجمع میرے گھر کے سامنے اکٹھا تھا۔ میں گھبرا گئی۔ خود سے کہا کیا میرے گھر میں کوئی واقعہ رونما ہوا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میرے بچے...

میرا دل مضطرب ہوگیا۔ لوگوں کی بھیڑ قطار در قطار شانہ بشانہ میرے گھر کے سامنے کھڑی تھی اور ایک دوسرے کو دھکا مکی کر رہی تھی۔ میں نے غور سے ان کے سراپا کا جایزہ لیا۔ عجیب چہرے تھے۔ ایک اندھی عورت جو میری بغل میں تھی اپنی سوکھی اشارہ والی انگلی سے لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی میں بھی ہوں اے شیخ، میری بھی فریاد رسی کرو۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ یعنی ایسا کیا ہوگیا تھا۔ میں نے اس عورت کے خشک بازوؤں کو پکڑا اور پوچھا:

''بی بی کیا ہوا ہے۔ یہ بھیڑ کس لیے ہے''۔

اس ضعیفہ نے اپنی بے نور آنکھوں کو آسمان کی طرف گھمایا اور بڑی بے تابی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

''ہم اس گھر کے مہمان ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ (صاحبِ خانہ) بہت کریم آدمی ہے''۔

میں جلدی سے بھیڑ میں چلی گئی۔ میرا دل اس ضعیفہ کے لیے کڑھ رہا تھا۔ اس کا لباس پرانے سوتی کپڑے کا تھا اور اس کے ہاتھوں کی پھولی ہوئی نسیں ایسی تھیں جو گنی جا سکتی تھیں۔ آنکھیں اس کی خشک ہو چکی تھیں اور بھوک اس کے ہونٹوں کے اطراف کی سپیدی سے ظاہر تھی۔

میں اِسی اُدھیڑ بُن میں تھی۔ پھر بھی سمجھ نہیں سکی کہ آخر بات کیا ہے۔ اس اُمڈتی ہوئی بھیڑ میں میں نے شیخ کو دیکھا کہ ان کا ہاتھ برابر اُوپر اُٹھتا ہے اور نیچے آتا ہے۔ لوگ مٹی کا کٹورہ اپنے ہاتھوں میں لیے انہیں آواز دے رہے تھے۔ میں چھوٹے دروازہ سے ہوتی ہوئی صحن میں آئی۔ چھوٹی عمر کے سات آٹھ بچے حوض کے کنارے بنے بیضوی باغیچے کے پاس گھوم رہے تھے۔ بڑا عجیب منظر تھا۔ ہمارا گھر میرے نہ ہونے پر کیا ہوگیا تھا۔ دروازہ پورا کھلا ہوا، لوگوں کے بچے باغیچہ کے کنارے اور شیخ لوگوں کی بھیڑ میں۔ میرے ہاتھ میں تھیلا تھا جسے دالان میں رکھ دیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے میری طرف دوڑ پڑے اور اپنے ہاتھوں کو میری طرف بڑھایا۔ غور سے ان کا جائزہ لیا۔ وہ سبھی ننگے پیر تھے۔ لگ رہا تھا کہ فقیر و محتاج ہیں۔ ناگاہ میری نظریں صحن کے گوشہ کی طرف چلی گئیں۔ وہاں خالی بوری اور دہی کے خالی برتن پڑے ہوئے تھے۔

گلی میں عورتوں اور مردوں کا شور و غل زیادہ ہوگیا تھا۔ کچھ چھوٹے بچوں نے میری چادر کو پکڑ لیا۔ ایک نے منت سماجت سے کہا:

''آنٹی کھانا۔ آنٹی روٹی!''

میرا بیٹا تہ خانے سے نکلتے ہوئے دکھائی دیا۔ مجھے جیسے ہی دیکھا ٹھٹکا، پھر ہنسا اور بچوں کو اپنی طرف بلایا۔ سوکھی روٹی کا ایک ٹوکرا اس کے ہاتھوں میں تھا۔ بچے اس

طرف دوڑ پڑے۔ وہ دالان کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ میں اس کے اس عمل پر متعجب ہوئی۔ وہ ہمارے دوپہر کے کھانے کے لئے رکھی ہوئی روٹیوں کو بچوں میں بانٹنا چاہتا تھا۔ وہ ہنس کر میری طرف دیکھتے ہوئے روٹیوں کو ان لاغر اور خواہشمند ہاتھوں میں جو اس کی طرف بلند تھے دیتا جا رہا تھا۔ بچے روٹی کے ٹکڑوں کو جھپٹا مار کر لے رہے تھے اور خوشی خوشی گھر سے جا رہے تھے۔ اب کوئی نہیں تھا۔ میں نے کھا جانے والی آنکھوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا اور کچھ کہنا چاہا کہ اس نے خالی ٹوکری زمین پر رکھ دی، میرے قریب آیا اور کہا:

''ماں! یہ لوگ روٹی کے انھی ٹکڑوں کے محتاج تھے۔ بابا نے کہا کہ ہمیں ان کی کچھ مدد کرنی چاہئے''۔

شیخ نے بالآخر اپنا کام کر دکھایا اور ہماری پوری پونجی کو لوگوں میں بانٹ ڈالا۔ شیخ صحن میں آئے اور مجھے سلام کیا۔ نہ تو جسم پر عبا تھی اور نہ ہی سر پر عمامہ۔ مزدوروں کی مانند ہو گئے تھے۔ آستینوں کو اوپر چڑھا رکھا تھا۔ ہاتھ میں ایک بالٹی اور پیالہ تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ گئی کہ شہر کے فقیروں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہماری ناداری کی مہمان تھی۔ شیخ باورچی خانہ میں گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ شیخ پیچھے کی طرف مڑے اور پُر درد آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہا:

''اچھا ہوا تم جلدی آ گئی۔ آؤ مدد کرو''۔

اس کے بعد تانبے کی بالٹی کو دیوار کے کنارے رکھ دیا۔ آٹے کی دوسری بوری آدھی خالی ہو چکی تھی۔ کچھ کہنا چاہا مگر دل راضی نہیں ہوا۔ ہمت نہیں ہوئی کہ ان کے سامنے کچھ کہوں۔ ان کی عجیب نگاہوں نے مجھے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ میں اپنی آنکھوں کی حیرانی کو ان کی نظروں میں لے آؤں۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی چھوٹی بوری کا سرا پکڑا اور شیخ نے پوری بوری آخر تک بالٹی میں اُنڈیل دی۔ پھر بالٹی، بوری اور پیالہ کو لے کر زینہ سے اوپر چلے گئے۔

خاموشی نے صحن میں موجود تمام فقیر عورتوں اور مردوں کے ہونٹ کو گویا سل دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ صحن میں ایک بھی متنفس موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کی نظریں شیخ پر پڑیں اور ان کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ان لوگوں نے شیخ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ شیخ نے اسی چھوٹے پیالہ سے ایک ایک کو ان کے برتن میں آٹا دیا۔ ہر شخص کا برتن بھر گیا۔ وہ سب دعا دیتے ہوئے خوش خوش چلے گئے۔ پیالہ بالٹی کی سطح سے ٹکرایا۔ ابھی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور دو بوڑھی عورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ شیخ نے انہیں خالی بوری دکھائی اور دکھ بھرے لہجے میں کہا:

''ختم ہو گیا۔ یہ آخری بوری تھی''۔

ایک بوڑھی عورت نے رونا شروع کر دیا اور بہت ہی لجاجت سے کہا:

''شیخ! میرا شوہر بیمار ہے''۔

ایک دوسری بوڑھی عورت نے نالہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''مردوں نے اپنے زورِ بازو سے ہجوم کیا اور جو کچھ آٹا تھا وہ چھین لے گئے اور ہم بھوکے رہ گئے، اور...''

میرا دل رنجیدہ ہوا۔ میں جانتی تھی کہ شیخ میں اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔ ان کا دل جلدی ٹوٹ جائے گا۔ آنکھیں خونبار ہو جائیں گی اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ ایک مرتبہ اپنا رُخ میری طرف کیا، ان کی نمناک آنکھوں نے میرے دل کو تازہ غم سے بھر دیا۔ میں کیا کہہ سکتی تھی۔ شیخ کمرے کی طرف چل پڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے گئی۔ کمرہ میں جہاں اپنے لوگوں کے لیے غذا رکھی ہوئی تھی وہ اس سمت گئے۔ میں بھی دروازہ کی طرف چلی۔ شیخ نے ہم لوگوں کے دوپہر کے کھانے کے سامان کو اٹھایا تا کہ انہیں دے دیں۔ میں نے کہا:

''جناب آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ ان کے لیے...''

شیخ نے روٹیوں کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا اور کچھ کھجور مجھے دیئے اور کہا:

''تمہارے اور بچوں کے لیے''۔

باقی سامان کو اُٹھایا اور صحن میں لے گئے۔میرا دل پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میں نے کمرہ کے اندر ہی سے اپنی گردن اُچکائی۔دیکھا کہ اس مرد اور دونوں بوڑھی عورتوں نے اپنا حصہ لیا اور چلے گئے۔شیخ نے دروازہ کی کنڈی لگائی اور اسے بند کر دیا اور اس کے بعد اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا اور دُعا کی:

''پروردگار شکر، ہزار بار شکر کہ احمد روسیاہ نہ ہوا''۔

میں کمرہ کی طرف گئی۔کچھ کہنا چاہا۔میری طرف محبت سے دیکھا۔مجھ میں ان کی خستہ نگاہوں کو دیکھنے کی تاب نہ تھی۔بہت پریشان ہوئی۔بچوں کی خاطر مجھے تیز آواز میں نہیں بولنا چاہیے تھا۔طاقت نے جواب دے دیا۔روتے ہوئے کہا:

''میں خاموش ہوں اور کچھ بھی نہیں کہہ رہی ہوں لیکن آپ دھیان نہیں دیتے۔آپ نے ہمارے بچوں کے کھانے کے سامان کو لوگوں کو کیوں دے دیا۔شاید آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم بھی ان لوگوں کی طرح دوسروں کے آگے اپنا دستِ سوال دراز کریں''۔

میں نے اپنے تر چہرے کو زانوؤں پر رکھا۔پھوٹ پھوٹ کر رونے کی کیفیت نے مجھے سانس لینے کی بھی مہلت نہ دی۔میرا دماغ صدمہ سے دوچار تھا اور دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔میری نگاہیں کھڑکی کے پیچھے سے شیخ کی طرف گئیں۔شیخ گردن جھکائے تھے۔ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ میں ان سے سختی سے بات کی تھی۔یہ بات میرے اختیار میں نہ تھی۔میں نے کوشش کی تھی کہ شیخ کی سادہ زندگی اور ان کی غریبی کے ساتھ تال میل بنا کر رکھ سکوں لیکن بچے...

میں بے اختیار آپے سے باہر ہوگئی تھی۔اتنی سخاوت کو میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔شیخ محزون تھے۔لگتا تھا ان کے چہرے کا نور غائب ہوگیا ہے۔ان کے ابرو کھنچے ہوئے تھے۔میں پھر رونے لگی۔اچانک شیخ اپنے کمرہ میں چلے گئے۔تھوڑی دیر بعد

جلدی سے باہر آئے۔عجیب بات تھی کہ چھٹی کے دن قبا پہن رکھی تھی اور سر پر سفید عمامہ اور کاندھے پر عبا ڈالے گھر سے باہر جانا چاہتے تھے۔میں نے ہاتھ سے ان کی طرف اشارہ کیا۔شیخ چلے گئے۔میرے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور نیچے کی طرف آ رہے۔ دل پذیر سورج ہمارے گھر اور صحن پر پڑ رہا تھا، مگر میری آنکھیں اور دل رو رہا تھا۔اپنی آنکھوں کے نم کوشوں کو انگلیوں کی پور سے پوچھا اور خود سے کہا کہ شیخ اتنی عجلت میں کہاں چلے گئے؟

شیخ کو گئے ہوئے ایک دن ہو چکا تھا۔میرے لیے یہ کئی روز کے برابر تھا۔پریشانی کے سبب میرا دل ہزاروں وسوسہ سے دوچار تھا۔میں نے خود سے کہا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے مولیٰ کے پاس نجف چلے گئے ہوں یا ہوسکتا ہے کہ حرمِ سیّد الشہداؑ میں خلوت نشین ہو گئے ہوں۔

میں جانتی تھی کہ عبادت اور تضرع کے لیے گئے ہیں مگر کب تک۔ان کا موجود نہ ہونا بھوک اور دوسری تمام چیزوں سے زیادہ گراں تھا۔بچے برابر ان کا پتہ پوچھ رہے تھے اور ان کی نظریں دروازہ پر ٹکی تھیں۔مجھے معلوم تھا کہ شیخ میری وجہ سے پریشان ہوئے ہیں مگر ان کے چلے جانے کے بعد میں بہت زیادہ پشیمان ہوئی۔اپنے آپ کو لعنت ملامت کی کہ مجھے ان سے ترش روئی نہیں کرنی چاہیے تھی۔جو کچھ بھی ہو اُن کے ہر کام میں ایک مصلحت ہوا کرتی ہے۔وہ کربلا، کوفہ اور نجف کے آقا اور بزرگی میں زبان زدِ خلائق تھے۔ان کی نماز اور دُعا کی خوشبو سے ہمارا گھر اور ہم لوگوں کی زندگی بہشت ہوگئی تھی۔

صبح بہت ہی پُرکیف تھی۔میرے لئے نہیں بلکہ بچوں کے لیے جو صحن میں شور مچا رہے تھے۔ہوا نے باغ کے پرانے پیڑوں کی خوشبو کو گھروں میں بکھیر دیا تھا۔بچے باغ میں دھول مٹی میں کھیل رہے تھے اور روزانہ کی طرح اپنے لیے مٹی کے اونٹ اور قلعہ بنا رہے تھے۔ہمارے پھولوں سے بھرے اس باغیچہ میں ایک تازہ درخت تھا، جس

نے پچھلے سال سے زیادہ پھل دیا تھا اور اس کی خوش رنگ چھتری نے سورج کی کرنوں کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ میں نے غم کے ساتھ اپنے چہرہ کو نرگس کے چھوٹے درخت کی طرف گھمایا۔ اس کے شوخ زرد رنگ کے ایک پھول کو سونگھا۔ عجیب بات تھی، اس کی خوشبو شیخ کے پیرہن کی خوشبو جیسی تھی۔ میں نے اسے دوبارہ سونگھا کہ اچانک دروازہ پر دستک ہوئی۔ بچوں نے اپنی نگاہیں دروازہ کی طرف کیں۔ مگر وہ یہ جان گئے کہ دروازہ کے کھٹکھٹانے کا انداز ان کے بابا کے جیسا نہیں ہے۔ دروازہ پر جڑی ہوئی دھات پر دوبارہ ایک خوش آہنگ دستک ہوئی۔ میں نے اپنی چال تیز کی اور دروازہ کی طرف بھاگی۔

''کون ہے؟''

''شیخ احمد کا فرستادہ''۔

''شیخ کا فرستادہ؟''

فوراً دروازہ کی زنجیر کھولی اور اس کا داہنا پلّہ اندر کی طرف کھینچا۔ اچھی سی خوشبو ناک میں آئی۔ ایک لمبے قد وقامت والا پردیسی مرد اپنے سفید گھوڑے کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے لطف ومہربانی سے سلام کیا اور کہا:

''شیخ کوفہ کی مسجد میں حالتِ اعتکاف میں ہیں۔ سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ میں آپ کے لیے آٹا لے جاؤں''۔

اس کے بعد گھوڑے کی زین پر رکھی بوری کو اُٹھایا اور دروازہ کے قریب رکھ دیا۔ میں حیران تھی کہ شیخ خود کیوں نہیں آئے۔ یہ بوری کہاں سے فراہم کی اور وہ انجانا آدمی کون تھا۔

مرد نے خوش اخلاقی سے خدا حافظ کہا۔ سفید گھوڑے پر سوار ہوا اور ہوا کی مانند چلا گیا۔ بڑی زحمت سے بوری کو باورچی خانہ تک لے آئی۔ جب میں نے اس بوری کے منہ کو کھولا، ایک دلنواز مہک اس سے نکلی۔ ناقابلِ یقین خوشبو بالکل ہمارے نرگسی

پھول جیسی تھی مگر اس سے زیادہ خوشبو اس میں تھی۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنی اچھی خوشبو وہ بھی آٹے کی اس بوری سے!

ایک چٹکی آٹا جو نہایت ہی سفید اور ملائم تھا ناک کے قریب لے آئی۔ ایسا لگا کہ مشک ہے کہ جس کی بہترین خوشبو باورچی خانہ کی فضا میں پھیل گئی اور اس جگہ کو معطر کردیا۔

○

شیخ جلد ہی اعتکاف سے واپس آگئے وہی ہمیشہ والی متانت لیے ہوئے، لیکن خاموش گم سم۔ بچے ان کے کندھے پر کھیل رہے تھے۔ جس وقت شیخ اپنے اونٹ کی کھال والے گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا:

''وہ آٹے کی بوری جسے آپ نے اس مہربان شخص کے ذریعے بھیجا تھا، اس سے کتنی اچھی خوشبو آرہی ہے۔ ہمارے گلِ نرگس کی طرح جسے آپ بہت زیادہ عزیز رکھتے ہیں''۔

شیخ کی بھنویں اُوپر کو تن گئیں۔ ان کے چہرہ پر سرخی دوڑ گئی۔ پوچھا:

''گیہوں کا آٹا! مرد مہربان کی طرف سے؟''

میں ان کے روبرو بیٹھ گئی اور بتایا کہ وہ پردیسی شخص ہمارے لیے بالکل اجنبی تھا۔ شیخ ہماری گفتگو کے درمیان ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا:

''الحمدللہ ربّ العالمین۔ پروردگار شکر الحمدللہ... الحمدللہ''۔

شیخ کا عمل میرے لیے حیران کن تھا۔ ان کی حالت بدل گئی۔ آنسوؤں کے موٹے موٹے قطروں سے جو اُن کی آنکھوں کے گوشوں سے جھانک رہے تھے لگتا تھا کہ منقلب ہوگئے ہیں۔ شیخ مڑے اور کمرہ کی دوسری جانب آسمان کی طرف نظریں گاڑدیں۔ میں نے سنا کہ زیرلب کہہ رہے تھے:

''حبیبِ من یہ کیسی مہربانی ہے جو آپ نے میرے فرزندوں کے حق میں

کی ہے۔اے کاش کہ میں گھر پر ہوتا۔کاش احمدا آپ کی زیارت کرتا۔
کاش...''

○○

۱۔ بزرگ اور فرزانہ عالم شیخ احمد بن محمد اردبیلی جو مقدس اردبیلی کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ اسلامی علوم میں بلند درجے پر فائز تھے اور سادہ زندگی، پرہیزگاری اور تقویٰ میں وقت کے نامور علما میں سے ایک تھے۔ ۹۲۰ یا ۹۳۰ قمری میں اردبیل میں پیدا ہوئے۔ نجف کے حوزہ میں بلند پایہ مرجع ہوئے اور ۹۹۳ قمری میں اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ حرمِ امام علیؑ کے جوار میں سپردِ خاک ہوئے۔

تاروں بھری رات

میں نے ایک اونچی چھلانگ لگائی اور دیوار کی گھاس پھوس والی منڈیر کو پکڑ لیا اور بہ دقت تمام خود کو اوپر کھینچا اور منڈیر پر چلنے لگا۔ پھر میں نے چھت کا رُخ کیا۔ ہوا کے تازہ جھونکے کی خنکی گردن کے چاروں طرف محسوس ہوئی۔ جسم کو آرام ملا۔ احتیاط سے جھکا اور چھت پر جست لگائی جو کہ منڈیر سے اُونچی تھی۔

''ڈرو مت۔ ذہن میں برے خیالات نہ لاؤ۔ شیخ[1] اپنے کمرہ میں بالکل اکیلے ہیں۔ ان کا ملازم ملا رحمت اللہ دوسرے کمرہ میں سویا ہوا ہے''۔

یہ انہی لوگوں میں سے کسی کی بات تھی جو میرے ذہن میں گھوم رہی تھی۔ جھکا جھکا میں دالان کے آخری کنارے پر جا پہنچا۔ کھجور کا ایک درخت چھت تک پھیلا ہوا تھا۔ اس درخت کے تنے کو پکڑ کر مجھے نیچے اترنا تھا۔ عبداللہ اور اس کے چیلے چپاٹوں کا خیال آتے ہی مجھ پر وحشت طاری ہوگئی۔

ہم لوگ شہر کے ویران قبرستان میں شام کے وقت اکٹھا ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے شیخ کو قتل کرنے کی سازش کی تھی اور یہ طے پایا کہ آج ہی رات میں اس سازش کو عملی جامہ پہناؤں اور اس کے بدلے میں اگلے دن وہ مجھے کافی پیسہ دیں گے۔ میں نے شیخ کو کئی بار دیکھا تھا۔ شہر کی ایک مسجد میں نماز پڑھاتے تھے۔ میں بے حد نادار تھا۔ میری بیوی اور بچوں کے شب و روز میری تنگ دستی کے سبب بد سے بدتر تھے۔ کوئی

۱۔ شیخ مرتضیٰ انصاری۔ نجف اشرف میں شیعوں کے بزرگ علما اور مراجع میں سے تھے۔

چارہ نہ تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ بس آج ہی کی رات میں انجام پانے والا تھا اور کسی کو بھی خبر نہ ہوگی۔ ادھیڑ عمر کے عربی شخص عبداللہ کی پیشکش مجھے ان لوگوں کے ساتھ کھینچ لائی تھی۔ اس رات عبداللہ کی بے رحم اور خوفناک آنکھیں غصہ سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس کی اور اس کے دوستوں کی رگوں میں شیخ کی دشمنی تازہ خون کی مانند جوش مار رہی تھی۔ کاش کہ شیخ جلدی سے میرے چنگل میں آجاتا اور میں اس کے شر، عبداللہ اور اس کے دوستوں کے فتنہ و فساد اور اپنے فقر کے شر سے جو میرے گھر میں مکڑی کے جالے کی طرح پھیلا ہوا تھا چھٹکارا پا جاتا۔

کسی کی آواز سنتے ہی میں چھت پر لیٹ گیا۔ تھوڑا سا سر کو اُٹھایا۔ آواز غالباً صحن سے آئی تھی۔ اطمینان سے اوپر کی منزل کے سرے پر پہنچا اور صحن کی طرف نظریں دوڑائیں۔ سناٹا تھا۔ پیڑ کے مضبوط اور موٹے تنے کو آرام سے اپنی گرفت میں لیا۔ پیروں کو پیڑ کے تنے کی برآمدگی پر ٹکاتے ہوئے دھیرے سے میں نیچے اُتر آیا۔

رات ستاروں بھری اور پر کیف تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اُونچے درختوں کے پتوں کو مرتعش کر رہی تھی۔ پتوں کی سرسراہٹ سے میرا دل دہل رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ جنات ہیں جو گھر کے پرانے آنگن میں آمد و رفت کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے لباس کی ڈوری کو کس کے باندھا اور اس کمرہ کی طرف بڑھا جدھر سے ہلکی ہلکی روشنی آرہی تھی۔ عبداللہ کے دوست ہاشم کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

''اس کے قریب پہنچ کر استخارہ نہ کرنا، جلدی سے اپنا خنجر باہر نکال اور ان کا پیٹ پھاڑ دے''۔

میں صحن کے اندر اپنے سایہ کے لمبے ہونے سے ڈرا۔ لباس کے اندر چھپے ہوئے خنجر پر ہاتھ پھیرا۔ تھوڑا سکون ملا۔ چپکے سے کمرے کے ایک کونے سے ہوتا ہوا کمرہ کے اندر کا جائزہ لیا۔ غالباً وہ بیدار تھے۔ میں نے اپنے سر کو ان کے قریب کیا وہ اکیلے تھے، بالکل اکیلے۔ یہ وہی تھے جنہیں میں نے بازار میں کئی بار دیکھا تھا۔ اسی عجیب و

غریب نگاہوں اور نرم اور بھری بھری داڑھی کے ساتھ جانماز پر کھڑے تھے۔ غالباً نماز ادا کر رہے تھے، وہ بھی رات کے اس وقت۔

''بلا وجہ خود کو مسلمان بتلاتا ہے۔ یہ انہیں منافق اور چاپلوس لوگوں میں سے ہے، نہ خدا کو پہچانتا ہے اور نہ خدا کے رسول کو۔ یہ ان متعصب شیعوں میں سے ہے جو نامناسب باتوں کو لوگوں کے ذہن میں ڈالتا ہے۔ اے بھائی، نہ ڈر۔ اگر تو اس کے شر کو کم کرے گا تو پیامبر کے سامنے سرخ رو ہوگا، اور ہم بھی... تمہیں اچھا صلہ دیں گے۔ اے بھائی، تو خوش بخت ہوگا''۔

عبداللہ کی باتیں برابر میرے دل و دماغ میں گونج رہی تھیں۔ کوئی چارہ نہ تھا۔ اگرچہ ان لوگوں کی شیخ سے دشمنی کے بارے میں میں ٹھیک سے نہیں جانتا تھا لیکن ان کے قتل کے عوض اچھی خاصی رقم وہ مجھے دیں گے۔ یقیناً یہ انسان بے دین ہے اور اسے نیست و نابود ہونا چاہیے۔

میں کمرے کے پیچھے سے ہوتا ہوا آہستہ اور دبے پاؤں کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ شیخ کی تسبیح و تحلیل کی آواز جانے پہچانے انداز میں میرے قلب پر اثر انداز ہوئی۔ میں نے غور سے کان لگا کر سنا۔ عبداللہ کا چہرہ دوبارہ میری نظروں میں گھوم گیا۔

''دھوکا مت کھانا اور اس کے بہکاوے میں نہ آنا۔ اپنے کام پر ڈٹے رہو۔''

میں نے خنجر پر ہاتھ رکھا۔ شیخ شاید رو رہے تھے۔ جانماز پر بیٹھے ہوئے تھے اور شمع کی مانند آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کمرہ میں چکرا دینے والی خوشبو پھیلی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں ڈرا کہ کہیں شیخ میرے دل کی دھڑکن نہ سن لیں۔

''سایہ کی طرح ان کے سر پر پہونچ کر خنجر سے ان کا کام تمام کر دوں گا، اے خدا میری مدد کر۔ یہ کیا شیخ سجدہ میں چلے گئے۔ کیسا رہے گا اگر میں سجدہ کی حالت میں ان پر حملہ کر دوں۔ نہیں، نہیں۔ اس طرح ٹھیک نہیں

ہے۔ٹھہرو تا کہ یہ کھڑے ہوں۔اس طرح جوانمردی کے خلاف ہے"۔

میں نے اپنے خنجر کو کانپتے ہاتھوں سے باہر نکالا۔ فانوس کی روشنی کی چمک خنجر کے بیچ میں منعکس ہوئی۔اچانک شیخ نے سجدہ سے سر اُٹھایا۔اپنے آنسوؤں کو پوچھا اور اپنی تسبیح کو ہاتھوں میں لے لیا، یہی موقع تھا۔

"میرا ہاتھ کانپ کیوں رہا ہے۔ کیوں شیخ کے سر پر نہیں پڑ رہا ہے۔اے میرے خدا میرا جسم موجوں کی طرح پیچ و تاب کیوں کھا رہا ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ شیخ باخبر ہو جائیں، اور میری جان کے پیچھے پڑ جائیں۔اے وائے، میں اس طرح سے کیسا ہو گیا ہوں"۔

ایسا لگتا تھا کہ شیخ کسی سے گفتگو کر رہے ہیں، مگر کمرہ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ سے بات کر رہے ہوں۔نہیں، ڈر کے مارے اپنے سر اور چہرہ سے پسینہ پوچھا اور ان کی گفتگو کو غور سے سننے لگا۔

"اے میرے پروردگار! میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ کچھ ناہنجار لوگوں نے اس بے گناہ شخص کو مجھے قتل کرنے کے لیے آمادہ کیا ہے۔اے میرے پروردگار! مجھے علم ہے کہ وہ ناواقفیت کی بنا پر میرے گھر میں داخل ہوا ہے۔الٰہی میں نے اس کے قصور کو معاف کیا، تو بھی اسے عفو فرما"۔

"کیا! کیا کہتے ہیں یہ شیخ۔انہوں نے کیسے جانا کہ میں ان کے گھر میں آیا ہوں۔عبداللہ اور اس کے دوستوں کو کیونکر جانتے ہیں۔اصلاً وہ میرے دل میں نہیں ہے، پھر کیونکر وہ میرے دل کے راز کو جانتے ہیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ جادوگر... نہیں، نہیں۔ وہ تو بہت ہی سادہ انسان ہے۔ بظاہر صورت سے تو ایسا نہیں لگتا۔ دیکھنے میں تو بہت ہی مہربان نظر آتے ہیں"۔

میں حیرت زدہ رہ گیا۔شیخ نے مجھے نہیں دیکھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے سے

واقف ہیں۔ یہاں تک کہ میرے ہاتھ میں جو خنجر ہے اس کی بھی انہیں خبر ہے۔ مجھے اپنا دَم گھٹتا محسوس ہوا۔ ایسا لگتا تھا گویا کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔لگتا تھا کہ سانس گھٹ رہی ہے۔ گویا میں اپنے آپ ہی بے خود ہوا جا رہا ہوں۔ میرا ہاتھ کانپا اور خنجر زمین پر گر پڑا۔

"پروردگار یہ کیسی غلطی ہوئی۔ وہ یقیناً بڑے انسان ہے جو ہر چیز کی خبر رکھتے ہیں۔ پروردگار میں عبداللہ کے فریب کا شکار ہو گیا"۔

شیخ مڑے اور بہت ہی مہربانی سے میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ میں رونے لگا اور چہرہ تر ہو گیا۔ ہونٹ ہل رہے تھے مگر تابِ گویائی نہیں تھی۔ زبان خشک ہو گئی تھی۔ شیخ نے سلام کیا، اور کہا:

"اے بندۂ خدا، خوش آمدید"۔

میرے ہونٹوں میں پہلے سے زیادہ لرزش پیدا ہوئی۔ بے اختیار میں ان کے پیروں پر گر پڑا۔ دہاڑیں مار کر رونے لگا۔ شیخ نے کس شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کیا لطف و مہربانی تھی جو میں نے اپنی زندگی میں کسی سے نہیں دیکھی۔ میرے چہرے سے آنسوؤں کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے پوچھا۔

"اطمینان رکھو بھائی، دھیمی آواز میں بولو تا کہ کسی کو خبر نہ ہو"

"شیخ کیا کہہ رہے تھے۔ مجھے بھائی کہہ کر پکارا۔ پروردگار! یہ کون سا بدقسمتی کا کام تھا جو ان لوگوں نے میرے سپرد کیا۔ پہلے سے معلوم تھا کہ شیخ سے ان کی دشمنی غلط تھی۔ یہ سب ان کے نامناسب کاموں کے سبب تھا تا کہ شہر میں انہیں کوئی روکنے والا نہ ہو"۔

میں نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ شیخ نے پھول سے زیادہ نازکی کے ساتھ میری طرف نگاہ ڈالی اور کہا:

"ابھی اسی وقت اپنے گھر جاؤ کہ تمہاری بیوی اور بچے تمہارے منتظر ہیں۔

کل ظہر کے وقت نماز کے بعد مسجد آؤ مجھے تم سے کچھ کام ہے"۔

میرا دل پرسکون ہوگیا تھا۔ میں اس درخت کی مانند ہوگیا تھا کہ جس کی جڑوں میں میٹھا پانی ڈالا گیا ہو۔شرم سے میں نے شیخ کی صاف و شفاف نگاہ سے نظر چراتے ہوئے اپنی راہ لی۔

○

گذشتہ رات کتنی بھاری اور سخت رات تھی۔عبداللہ اور ان کے ناہنجار چیلے چپاٹوں سے اللہ کی پناہ! انہوں نے اپنی دانست میں مجھے جال میں پھنسا دیا تھا۔اگر پھنس جاتا تو میرا بدترین دشمنان خدا میں شمار ہوتا۔خدا نے میری مدد کی کہ میرا ہاتھ کانپا، اور شیخ نے میرے ساتھ محبت کا سلوک کیا۔کس قدر ارجمند ہیں۔ذرّہ برابر بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ دشمنِ خدا اور پیامبر ہوگا۔ان کے سر اور چہرہ سے نور برس رہا تھا۔گویا اس کی بلند پیشانی سورج کے لیے مثل آئینہ ہوگئی تھی۔اس کی آنکھوں کے آبگینہ میں خورشید کس طرح منعکس تھا۔پوری رات جاگتا رہا۔اپنے بارے میں،عبداللہ اور اس کے دوستوں، ان کے پُرفریب وعدوں اور شیخ کے بارے میں جو میرے باپ کی طرح مجھ پر مہربان تھے غور و فکر کرتا رہا، اور شیخ کی خواہش کے مطابق جیسا کہ انہوں نے کہا تھا، ظہر کی نماز کے بعد میں ان کی طرف چل پڑا، یعنی انہیں مجھ سے کیا کام ہے۔

نہیں میں کوئی برا خیال دل میں نہیں لایا۔وہ گذشتہ رات کی تلافی نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ اگر وہ چاہتے تو اسی وقت مجھے سزا دیتے۔میں نے کہا شاید، شاید، مگر میری فکر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا تا کہ کہیں عبداللہ میرے سامنے نہ آجائے۔میں نے اپنی راہ لی۔

مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی مگر اس بھیڑ میں ایک طرح کا سکون تھا۔ نماز تمام ہوئی اور لوگ اپنی اپنی راہ چل پڑے۔میں شیخ کے قریب گیا۔انہوں نے مجھے اچھی طرح دیکھا، ان کی نگاہوں میں کس قدر کشش تھی۔ان کی دعا جب ختم ہوگئی،

مڑے اور محراب کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئے۔کچھ لوگ اس نورانی ہستی کے اِردگرد حلقہ کیے ہوئے تھے۔جب مجھے دیکھا مسکرائے پھر ان لوگوں سے کچھ کہا۔وہ لوگ کھڑے ہوئے اور چلے گئے۔شیخ نے مجھے اشارہ کیا۔میں بصد ادب ان کے پاس گیا۔

"جناب سلام علیکم"۔

"سلام علیکم۔تم کیسے ہو؟ تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟"

میں بیٹھ گیا اور شرمندگی سے کہا:

"اچھے ہیں جناب۔میں کل رات کے عمل سے شرمندہ ہوں"۔

محبت سے ان کا گلاب سا چہرہ کھل اُٹھا، اور چاند کی مانند اپنے شیریں تبسم سے مجھے نوازا۔

"اسے بھول جاؤ، تمہیں کچھ معلوم نہیں تھا"۔

انہوں نے اپنی سادہ عبا کے اندر سے ایک چھوٹی سی تھیلی باہر نکالی اور اسے میرے ہاتھ پر رکھا۔سکوں کی کھنکھناہٹ نے مجھے حیرت زدہ کردیا۔انہوں نے بڑے دردمندانہ انداز میں کہا:

"یہ پیسہ پکڑو اور اسے اپنا سرمایہ بناؤ، مگر اس شہر میں نہ رہنا۔ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں تمہیں آسائش میسر ہو"۔

میری آنکھوں سے دوبارہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔میری پلکیں آنسوؤں سے تربتر ہوگئیں۔داڑھی شبنم سے بھیگ گئی۔میں نے شیخ کے نرم و نازک چہرہ اور ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ان کے جسم سے دل انگیز عطر کی خوشبو نکل رہی تھی۔ایسی خوشبو جس نے میرے ہوش و حواس کو مختل کردیا۔شیخ تمام باتوں سے باخبر تھے یہاں تک کہ میری تنگ دستی سے بھی۔

برسوں سے میں بغداد شہر میں ہوں۔میرے پاس کافی سرمایہ ہے، مگر یہ تمام مال و دولت شیخ کی برکت سے حاصل ہوئی ہے۔مگر میں نے اس مال و دولت سے ذرّہ

برابر بھی دل نہیں لگایا ہے۔ یہ تمام سرمایہ خدا اور پیغمبرؐ کے عزیز اہلِ بیت کی راہ میں صرف ہے۔ میں نجف اور بزرگوار شیخ کی قبر پر جانا چاہتا ہوں تا ان کی خاطر رو رو کر اپنے دل کو ہلکا کروں۔

○○

برکت والی کتاب

محمد رضا کربلائی کی آنکھوں سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ گویا دُنیا انہیں عطا کردی گئی تھی۔ چاہتے تھے کہ پر لگ جائے اور جلدی سے گھر پہنچ جائیں اور شیخ عبدالرزّاق کی شیریں گفتگو کو اپنے بیٹے شیخ عباس[1] سے لفظ بلفظ بیان کریں۔

کربلائی نے اپنی رفتار تیز کردی۔ گھر کے قریب پہنچے۔ گھر میں قدم رکھا۔ عبا اُتاری اور ہینگر پر لٹکا دیا۔ آہستہ سے اپنی نمدی ٹوپی کمرے کی چھوٹی الماری پر رکھی اور اپنی سادہ سی گاؤ تکیہ پر ٹیک لگائی۔ شیخ عباس ادب سے باپ کے قریب آئے اور سلام کیا۔ کربلائی نے محبت سے اپنے بیٹے کے سلام کا جواب دیا اور پھر اپنے شیریں خواب میں محو ہوگئے۔ جس دَم کتاب کی یاد آئی مسکرائے اور سوچنے لگے:

> ''شیخ عبدالرزّاق کتنے عالی مرتبت اور پڑھے لکھے انسان ہیں۔ گفتگو کتنی اچھی کرتے ہیں، لوگوں کے لئے کتنی عجیب وغریب حکایتیں بیان کرتے ہیں۔ کتنے دلنشیں انداز میں اپنی کتاب کے مسائل مجھ جیسے جاہلوں کو سکھاتے ہیں۔ خدا انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کی آخرت یقیناً شاد وآباد ہے''۔

شیخ عباس کی والدہ سینی میں چائے لے کر کمرہ میں آئیں۔ سلام کیا، چائے کی پیالی اپنے شوہر اور بیٹے کے پاس رکھ کر کمرہ سے چلی گئیں۔ شیخ نے اپنا قلم اپنی چھوٹی

۱۔ شیخ عباس: مرحوم شیخ عباس قمی۔

میز کے ایک طرف رکھا۔ ایک ضخیم کتاب کو ہاتھ میں لے کر بڑے غور سے اس کے بڑے صفحوں کو پلٹا۔ کربلائی نے خوشی سے اپنے سر کو گاؤ تکیہ سے ٹکا دیا اور خیالوں میں ڈوب گئے۔

''جب تک عمر وفا کرے گی روزانہ جناب معصومہؑ کے صحن مطہر میں جاؤں گا اور آقا شیخ عبدالرزّاق کے بیان کو سنوں گا۔ اگر میں اس کتاب کے لکھے پر عمل کروں تو خدا کی قسم میری آخرت سنور جائے گی۔ شیخ کا علم کتنا زیادہ ہے کہ ایسی کتاب کو اتنے سہل انداز میں تحریر کیا ہے کہ عام آدمی سے ایسا ممکن نہیں۔ کاش میرا باصلاحیت بیٹا شیخ عباس اس کتاب جیسی کوئی کتاب لکھتا۔ کاش اس کا علم اس پایہ کا ہوتا کہ لوگ کہتے کہ وہ برکت والی کتاب محمد رضا کربلائی کے بیٹے نے لکھی ہے۔ صرف اگر وہ شیخ کی طرح منبر پر جاتا اور ان کی کتاب کو لوگوں کو پڑھ کر سناتا اور اس کی تشریح و تفصیل بیان کرتا تو خود باعث خیر و برکت تھا''۔

شیخ نے دوبارہ قلم ہاتھوں میں لیا۔ آرام سے اپنے پتھر کی دوات میں ڈبویا اور سفید کاغذ کے اوپر دھیان سے لکھنا شروع کیا۔ کربلائی میں اب طاقت نہیں تھی کہ ہمیشہ کی طرح خاموش رہیں اور اس کتاب کے بارے میں بیٹے سے کچھ نہ کہیں۔ مصری کی ڈلی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا چائے میں ڈالا۔ پیالی کو جلدی سے اُٹھایا اور چائے کو پی گئے۔ پھر اسے تانبے کی چھوٹی سی سینی میں رکھ دیا، اور خوش روئی سے کہا:

''شیخ عباس، کاش تو شیخ عبدالرزاق مسئلہ کو کی طرح ہوتا!''

شیخ عباس کے خیالات منتشر ہوگئے۔ تعجب سے بغور باپ کے ہونٹوں کی طرف دیکھا تا کہ ان کی بات کو سمجھ سکے۔

''کاش کہ تم روزانہ منبر پر جاتے اور لوگوں کے لیے اس کتاب کو پڑھتے۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ لوگوں کو وہ کتاب کتنی پسند ہے۔ تم جانتے ہو کہ شیخ

اس کتاب کے پڑھنے کی وجہ سے کتنے زیادہ آدمیوں کو حرم کے صحن میں کھینچ لاتے ہیں؟ لوگ آسانی سے سمجھ میں آنے والے مسئلہ کو سن کر کتنے مسرور ہوتے ہیں''۔

شیخ عباس نے پوچھا:

''آقا جان کون سی کتاب؟''

''وہی... وہی کتاب۔ کتاب... منازل الآخرۃ کی بات کر رہا ہوں''۔

شیخ عباس نے مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سر کو خم کیا، کربلائی حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ شیخ عباس ہنسے اور کہا:

''دعا کیجیے کہ پروردگار مجھے توفیق عنایت کرے''۔

کربلائی نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا اور دعا کی۔ شیخ عباس نے کتاب کے بارے میں سوچا۔ کچھ کہنا چاہا، لیکن چپ رہے۔ پھر دل میں کہا۔

''نہیں۔ شاید یہ ریا ہوجائے۔ بہتر ہے کہ ابا جان نہیں جانتے کہ اس کتاب کا خالق خود میں ہوں۔ اس طرح میں زیادہ سکون میں ہوں اور وہ بھی سکون سے شیخ عبدالرزّاق کی تقریر سننے جائیں گے''۔

○○

تم تھے اور نجف کا لازوال سورج

کیا دل تھا، کیا ہمت تھی تمہیں یاد آ رہا ہے؟ اس روز تمہارے پیر لڑکھڑائے نہیں۔ تمہارے ہاتھوں میں رعشہ نہیں ہوا۔ تم نے پس و پیش نہیں کیا اور تمہیں مرنے کا خوف نہیں تھا۔ تمہارے دریائے نگاہ میں بس ایک چیز موجزن تھی، ایک چیز۔

''اگر وہ کتاب نہیں ملی تو پھر؟ تو میری تلاش و تحقیق پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گی''۔

بادِ نسیم کی طرح تم بھیڑ والی پتلی گلیوں میں رواں دواں تھے۔ تم کتنا تیز تیز چل رہے تھے۔ راستہ میں کسی نے شاید تمہارے کانوں میں التماس کر رہا تھا:

''اے بندۂ مومن! کدھر کا رُخ ہے؟ وہ تمہیں واجب القتل سمجھتا ہے، اپنا حکم بھی صادر کر چکا ہے، بجائے اس کے کہ تم خود کو اس سے اور اس کے دوستوں سے دور رکھو، چل پڑے ہو اور اپنے پیروں سے۔ علامہ یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا تم اپنی جان سے سیر ہو گئے ہو''۔

تمہارا دل جوش سے بھر گیا۔ زیرِ لب کہا:

''میری جان کی کیا قیمت ہے؟ میں اپنی جان اور تمام چیزوں سے مولیٰ کی خاطر دستبردار ہو چکا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی کام نہیں ہے۔ صرف... اس کتاب کی وجہ سے''۔

تمہارے پیروں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ سورج کی سنہری تھالی لڑھکی اور خود کو شہر

کے کچے اینٹ گارے کے مکان کی چھت پر لائی۔ کس قدر گرمی تھی، مگر تم... تم نہ تو گرمی سے پریشان تھے اور نہ آفتاب کی تپش سے فکرمند تھے۔ تم کو صرف اس کتاب کا خیال تھا۔ اسی پڑھنے لائق نادر کتاب کی فکر تھی۔

تمہارے دشمنوں سے خدا کی پناہ! وہی جاہل اور ان پڑھ لوگ! بے پرواہ، بے فکرے اور بے حوصلہ لوگ۔ وہی لوگ جو تمہاری آنکھ کے کانٹے تھے۔ جہاں کہیں بھی تمہارے نورانی چہرہ کو دیکھ لیتے تھے چمگادڑ کی طرح پر پھڑپھڑانے لگتے تھے اور تم سے راہِ فرار اختیار کرتے تھے، مگر تم صرف مسکراتے ہو۔ وہ مسکراہٹ کہ جس میں تازہ کھجور سی مزہ تھی۔ ایسی مزہ جو دیر تک زبان پر باقی رہتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر ان کے چہروں پر کس قدر غصہ دوڑ جاتا ہے۔ ان کی آنکھیں آگ کے دو گولے کی طرح ہو جاتی ہیں۔ اسپند کی طرح آگ پر جلنے لگتے ہیں۔ وہ تمہارے بارے میں غلط سوچتے تھے۔ ان کے ذہن میں غلط خیالات نے جڑ پکڑ لیا ہے۔ مگر تم تھے اور ایک خدائے بزرگ و برتر۔ تم تھے اور نجف کا مہرِ لازوال۔ تم تھے اور چودہ سبز روایتیں اور تمہاری تمام تحریریں انہی کے لئے تھیں۔ تم انہیں کے بارے میں سوچ رہے تھے جس سے تمہارا دل آباد ہے اور تمہارے خیال کو راحت و آرام۔

تم نے دو تین لوگوں سے اس کے پتے دریافت کئے۔ وہ لوگ تعجب سے تمہارے سراپا کو دیکھنے لگے اور پھر اس شخص کے گھر کا پتہ بتایا۔ شاید انہوں نے سوچا کہ ایک شیعہ عالم دین کو اس سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ زیادہ راستہ نہیں بچا تھا۔ تم نے بہت ہی اطمینان اور سکون سے ان تمام باتوں کو جو اس سے کہنی تھیں ذہن نشین کیا:

''فلاں کتاب کے لیے آیا ہوں۔ تمام لائبریریاں چھان ماری ہیں، بہت سے محققین کے گھر جا چکا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اس کتاب کا بس ایک ہی نسخہ ہے اور وہ بھی تمہارے پاس ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے تم سے بطور امانت چاہتا ہوں۔ ایک اہم موضوع ہے جس کا مطالعہ میرے لیے بہت

ضروری ہے''۔

تم نے خود سے کہا۔ یقیناً وہ اپنے ابرو پر بل ڈالے گا اور ماتھا سکوڑ کر کہے گا:

تم...تم...وہی ہو''۔

میں بھی کہوں گا:

''ہاں...میں امینی ہوں۔ میں وہی ہوں کہ جس کے قتل کا حکم آپ نے دیا ہے۔ میں اس کتاب کے کسی اہم موضوع کے لئے آیا ہوں۔ میں آپ کا مہمان ہوں۔اور بیشک...بیشک...وہ بھی...میں نہیں جانتا''۔

پتہ درست تھا۔تم اس کے گھر کے سامنے پہنچے۔تم اس کے بھوری رنگ کے لکڑی کے دروازہ کے قریب پہنچے، جس میں دو لوہے کی زنجیریں تھیں اور اس کے دونوں طرف پتھر کے دو زینے تھے۔خدا اور مولا کی یاد نسیم کی مانند تمہارے سینہ کے باغ میں چل رہی تھی، جس سے تمہارا غنچۂ دل کھل اُٹھا تھا۔

''میں خدا کی راہ میں شہادت سے نہیں ڈرتا۔میرے لیے یہ باعثِ افتخار بھی ہے، مگر میں اپنے پیروں سے خود چل کر اس لیے نہیں آیا ہوں کہ اس دشمنِ علیؑ کے جہل کی قربانی بنوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس اہم اور نایاب کتاب کے ذریعے جو اس کے کتاب خانہ میں ہے اپنی تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں۔خدا کی پناہ!''

تم نے دروازہ کی لمبی زنجیر کو پکڑا اور آرام سے دروازہ پر دو چار ضرب لگائی۔ دروازہ کھلا، گلی کے سورج نے گھر کے سایہ دار سائبان میں اپنی گرمی کا احساس دلایا۔ تمہارا سورج گھر کے مالک کی تاریک نگاہوں میں چمکا۔

''سلام علیکم''۔

''علیکم السلام۔فرمایئے۔کیا کام ہے۔ میں آپ کو پہچان نہیں پا رہا ہوں''۔

تمہیں کتابوں، شہرت اور نام سے پہچانتا تھا نہ کہ ہیبت ناک نگاہ، بلند بالا قد و قامت

اور تمہارے زیبا ابرو کی بنا پر۔

کسی نے بھی تمہارے کانوں میں سرگوشی نہیں کی کہ نہ بتاؤ، کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ پلٹ جاؤ۔ یہ بھی نہیں کہا کہ کیوں اپنے پیروں سے چل کر اپنے دشمن کے گھر آئے ہو۔شاید وہ تمہاری تحریروں کے سبب جو امیر المومنینؑ کی خاطر تھیں تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرے۔تمہارے عمامہ اور تمہارے عبا و قبا کو غور سے دیکھا، سمجھ گیا کہ تم شیعہ ہو اور اس نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔

''میں وہی ہوں کہ جس کے قتل کا حکم آپ نے صادر کیا ہے۔ میں امینی ہوں۔ ایک اہم موضوع کی تلاش میں ہوں جو صرف آپ کے ذاتی کتاب خانہ میں مل سکتا ہے''۔

آتش فشاں پہاڑ کی طرح اسے جھٹکا لگا۔غرایا، دانتوں کو پیسا اور اپنے جبڑوں کو سختی سے بند کیا۔تم نے سکون سے اسے دیکھا۔اس کی آنکھیں دو آگ کے گولے کے مانند ہوگئی تھیں۔ابھی کچھ ہوا نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔چند بار اپنی زبان کو حرکت دی، کچھ کہنا چاہا مگر کچھ سوچ کر چپ رہا۔وہ کتاب تمہارے لیے اتنی اہم تھی کہ نہ تو اس کی دشمنی کی فکر تھی نہ ہی اپنی جان کی فکر اور نہ ہی اس کی نگاہ کی پروا۔

بیٹھی آواز میں بڑی مشکل سے کہا:

''افسوس! افسوس کہ تم میرے مہمان ہو ورنہ اسی جگہ...''

پھر کچھ کہے بغیر دروازے کو آخر تک کھول دیا۔

''امینی[1] صاحب اندر آیئے''۔

ایک سوکھے بے جان تعارف کے بعد تم گھر کے اندر داخل ہوئے، پھر تم اس کے کتاب خانہ میں گئے۔ بڑی سی لائبریری، چھوٹی بڑی پرانی اور ہاتھ کی لکھی کتابوں کا ایک ڈھیر۔تم نے کتابوں کے درمیان نظر دوڑائی۔ نہ تو فہرست تھی، نہ کوئی راہنمائی کی

۱۔ آقای امینی: ''آیۃ اللہ عبدالحسین امینی الغدیر'' نامی کتاب کے مصنف۔

صورت اور نہ کسی طرح کی مدد۔ اس بڑے کمرہ میں کتابیں ہر جگہ نیچے سے چھت تک ترتیب سے قطار میں ایک پر ایک رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ایک کتاب کو دیکھنا اور کام کی کتاب کو تلاش کرنا گھنٹوں کا کام تھا۔ اس کی تمسخر آمیز نگاہ تمہاری طرف تھی۔ تم نے دل ہی دل میں کہا بیشک وہ سوچتا ہوگا کہ امینؑ نے خود کو میرے کتاب خانہ کے سمندر میں ڈال دیا ہے، اگر ماہر تیراک بھی ہو تو اس کے لیے نجات کا راستہ نہیں ہے۔

''میں خدا کے حکم سے پھرا نہیں ہوں۔ اگر چند گھنٹوں میں کتاب نہیں ملی تو میں اپنے فرض پر عمل کروں گا۔ جھوٹ، بے بنیاد باتوں اور تمہاری تہمت اور افترا پردازیوں سے ابھی بھی رنجیدہ ہوں''۔

فرض! کیسا فرض! بیچارہ سوچتا ہے کہ اس کا حکم خدا کا حکم ہے۔ وہ حکم علیؑ اور ان کے خانوادہ کی بے دریغ دوستی کے سبب تھا، تم ڈرے نہیں۔ تمہارا دل تمہارے سینہ میں مطمئن و پرسکون تھا۔ تمہاری طرف چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ تم نے اسے کتاب کا نام بتایا۔ پھر اپنی آنکھوں کو بند کیا اور دل ہی دل میں کہا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اے امیر المومنین! آپ سے مدد چاہتا ہوں''۔

تمہاری پلکیں اوپر اُٹھیں، تمہاری آنکھوں کی شبنم چمک اُٹھی۔ ایک شیلف کے پاس تم گئے۔ بے اختیار ہاتھ بڑھایا اور ایک کتاب باہر نکالی۔

اس نے اپنی آنکھیں پھاڑیں اور اُچک کر دیکھا۔ تم نے مسکراہٹ کے ساتھ کتاب کا ورق پلٹا۔ وہی تھی۔ تمہاری وہی گمشدہ کتاب۔ تم نے بے چینی سے دوبارہ اس کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہی صفحہ کھلا جس کی خواہش تھی۔ کتاب پر نشان لگایا اور شوق سے کہا:

''مل گئی۔ وہی کتاب ہے۔ خدا کا شکر ہے''۔

وہ تلاطم میں پڑ گیا۔ حیران ہوا۔ شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کے پیر کانپنے لگے۔ بے یقینی کے عالم میں ٹہلنے لگا اور عالمِ استعجاب میں تمہارے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی

کتاب پر نظر ڈالی۔ شرمندہ ہو کر کہا:

''بس بس، جلدی اسی جگہ اس کتاب کو پڑھ لو۔ میں... میں۔ تا کہ میں اپنے امور کو انجام دوں''۔

وہ ایک گوشہ میں چلا گیا اور اپنے چہرے کو بڑی سی کتاب میں چھپا لیا۔ تعجب سے اس کی زبان بند ہوگئی تھی۔ تمہارے دل سے اندیشہ دور ہو گیا، اور پھر شکر کی حلاوت سے لبریز ہو گیا۔

○○

شیخ بہائی و میر داماد

خوبصورت گھوڑا رکا۔اس کے بال ریشم کی طرح نرم و نازک اور ایک برابر کے تھے۔جس وقت وہ اپنا سم زمین پر مارتا تھا گویا خود کو پوری دُنیا اور تمام لوگوں سے بہتر سمجھتا تھا۔وہ کوہستان میں انگوٹھی کے نگینہ کی طرح چمک رہا تھا۔جب وہ رکا تو اس کی لمبی اور خوبصورت گردن غرور سے اوپر اٹھ گئی۔

شاہ نے چمڑے اور چاندنی کی کشیدہ کاری کی ہوئی لگام کو کھینچا۔چوڑے نتھنوں والا چاق و چوبند گھوڑا ایک مرتبہ پلٹا۔شاہ کے محافظوں نے ٹھہرنا چاہا کیونکہ بادشاہ کے گھوڑے کا ٹھہرنا اچانک اور غیر متوقع تھا لیکن شاہ نے مسکراہٹ کے ساتھ اشارہ کیا کہ وہ اپنا راستہ چلتے رہیں۔

شاہ نے وہیں سے میر داماد[1] کی طرف دیکھا جو انہیں کی سمت آ رہے تھے اور خود سے کہا:

''اچھا ہے ایک مذاق کرتے ہیں، دیکھیں کہ میر داماد کے دل میں کیا ہے۔ جو بھی ہو علم کا پہاڑ ہیں۔دیکھو کس طرح ہماری طرف دیکھ رہے ہیں جیسے کہ یہ پورا ملک، یہ حشم و خدم، یہ رعایا سب کچھ میری ملکیت میں

۱۔ میر داماد: صفوی دورِ حکومت میں شیعوں کے بزرگ علماء میں سے ہیں۔سیّد محمد باقر میر داماد دسویں ہجری کی دوسری نصف میں پیدا ہوئے۔وہ تمام علوم میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ان کی قبر نجف میں امام بارگاہ علیؑ کے گوشہ میں ہے۔

نہیں ہے''۔

گھوڑے کو ایڑ لگائی:

''میر داماد کو شیخ بہائی سے بھڑا دینا چاہئے۔اس طرح کوہستان کے سفر کا مزہ دوچند ہو جائے گا!''

میر داماد کا گھوڑا آ پہنچا۔میر داماد شاہ کو تعجب سے دیکھنے لگے اور چاہا کہ اپنے راستہ پر چلتے رہیں کہ شاہ نے اپنے گھوڑے کا رُخ ان کی طرف موڑا، جب ان کے نزدیک پہنچا تو ہنسا اور کہا:

''زمانے کے بڑے دانشور پر سلام''۔

میر داماد نے جواب دیا:

''علیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ''۔

شاہ نے گھوڑے پر سے ہی اپنا رُخ ان کی طرف کیا۔جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا:

''حضرت استاد، ذرا دیکھئے۔شیخ بہائی ہمارے آگے آگے چل رہے ہیں اور ہمیں ذرا بھی قابل توجہ نہیں سمجھتے۔۔مغرور آدمی لگتے ہیں''۔

میر داماد کی تیکھی نظر نے شاہ کو حیرت زدہ کر دیا:

''یہ بات نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مرکب جو اس جیسے عالم کو اپنے اوپر بٹھا کر لے جا رہا ہے وجد میں آ گیا ہے اور اسی وجہ سے تیز چل رہا ہے اور ہم سے آگے نکل گیا ہے''۔

شاہ حیران اور مبہوت چپ ہو رہا۔اپنے گھوڑے کو روکا تا کہ میرا داماد آگے بڑھ جائیں۔

''تعجب ہے۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں کچھ کہوں اور وہ اس کا کوئی جواب نہ دیں''۔

شیخ بہائی[1] دُبلے پتلے اور طویل القامت انسان تھے، جبکہ میر داماد موٹے تازے اور لمبی قد کاٹھی کے تھے۔شاہ نے شیخ بہائی کی طرف دیکھا۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کوہستان کے جنگلی پودوں کو لہرا رہی تھی۔ شاہ کا قافلہ پورے حشم و خدم کے ساتھ کوہستان میں رواں دواں تھا۔بٹیروں کی آواز آرہی تھی۔ شاہ سے ذرا فاصلہ پر مسلح سپاہی دائرہ کی شکل میں ترتیب سے چل رہے تھے۔ان کے درمیان بادشاہ تھا۔شیخ بہائی میر داماد اور حکومت کے کچھ عہدہ داران ایک دوسرے سے تھوڑے یا زیادہ فاصلہ پر تھے۔شاہ نے خود سے کہا کہ مجھے چاہیے کہ شیخ بہائی کی طرف چلوں اور اس بار انہیں میر داماد کے خلاف اُکساؤں جو کچھ بھی ہو دونوں علم میں ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔

خوبصورت گھوڑے کو ایڑ لگائی، گھوڑا میر داماد کو چھوڑتا ہو شیخ بہائی کے پاس جا پہنچا۔شاہ نے چاندی کے تاروں سے مزین گھوڑے کی لگام کو کھینچا۔

''شیخ العلماء پر سلام''۔

شیخ غالباً ذکر میں مشغول تھے، ہلکا سا ادھر دیکھا اور مختصراً جواب دیا:

''علیکم السلام''۔

شاہ ہنسا اور خود کو قریب لے آیا اور آہستہ سے کہا:

''شیخ ذرا پیچھے کی طرف دیکھئے''۔

شیخ آدھے بدن سے مڑے اور پیچھے کی طرف دیکھا۔پوچھا کس لیے؟ شاہ نے کہا:

''حضرت میر داماد کو دیکھئے ہمارے پیچھے ہیں گویا ہماری طرف توجہ نہیں کررہے ہیں یا خود کو آپ سے بالاتر سمجھتے ہیں''۔

شیخ بہائی کی پُرسکون آنکھوں سے تبسم غائب ہوگیا، کہا:

''وہ گھوڑا جو پیچھے اور آرام آرام سے چل رہا ہے، آہستہ خرامی کا حق رکھتا ہے''۔

۱۔ شیخ بہائی: شیخ بہائی عاملی معروف بہ شیخ بہائی صفوی دورِ حکومت میں شیعوں کے ایک بزرگ عالم۔

''کیوں شیخ؟''

''کیونکہ علم کے ایک دریا کو اپنے اوپر اُٹھا کر لے جارہا ہے''۔

شاہ عاجز ہوگیا۔ایسا لگتا تھا کہ ٹھنڈا پانی سر پر ڈال دیا گیا ہو۔اسی جگہ ٹھہر گیا اور سوچنے لگا۔شیخ بہائی کا مرکب اسی طرح دور ہوتا گیا۔شاہ نے خود سے کہا۔

''نہ شیخ بہائی نے ان کی مذمت کی اور نہ ہی میر داماد نے شیخ کی برائی کی۔ دونوں نے شاید قسم کھالی ہے کہ اپنے پاؤں صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹائیں گے۔تعجب ہے''۔

○○

لازوال مسافر

وہ لوگ ابھی ابھی شہر میں وارد ہوئے تھے۔ دونوں اجنبی تھے اور خستگی کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں تھے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور پورا شہر تازہ دم تھا۔

دزفول شہر کے ایک پرہیزگار عالم محمد امین اور ان کے جوان بیٹے جو کہ طالب علم تھے حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباس علیہ السلام کے حرم کی دور سے زیارت کرتے ہوئے شہر کی ایک گلی میں داخل ہوئے اور سیدھے اپنے پرانے دوست سیّد محمدا کے گھر کی طرف روانہ ہوئے جو کربلا کے حوزہ علمیہ کے بزرگوں میں سے تھے۔

جوان طالب علم جو اٹھارہ برس کا تھا پہلی بار اپنے والد کے ساتھ کربلا آیا تھا، مگر یہ شہر اس کے لیے غالباً جانا پہچانا تھا اور اس کے اندر ایک عجیب طرح کا احساس پیدا کررہا تھا۔ نیک دل اور مہربان لوگوں کے متبسم چہروں نے جسم سے تھکاوٹ کو دُور کردیا تھا اور خوشی و مسرت کی لہر رگوں میں دوڑا دی تھی۔

وہ اور اس کے والد اپنی زادگاہ دزفول شہر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے لمبا سفر طے کرکے امام حسینؑ کی زیارت کے شوق اور سیّد محمد کی ملاقات کے لیے کربلا آئے تھے۔

شیخ محمد امین کی سیّد سے پرانی دوستی تھی لیکن اس جوان طالب علم نے سیّد کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا صرف اپنے والد سے ان کے بارے میں چند باتیں سنی تھیں۔

۱۔ سیّد محمد: آیۃ اللہ العظمیٰ سیّد محمد باقر مجاہد کربلا کے حوزۂ علمیہ کے بزرگ مراجع میں سے ہیں۔

سیّد کی ملاقات کے انتظار میں یہ لمحے مشکل سے کٹ رہے تھے۔ شیخ محمد امین کو سیّد کے گھر کا بخوبی پتہ تھا۔ وہ اپنی ہمیشہ کی عادت کے برخلاف تیز قدم بڑھاتے رہے اور پورے راستہ میں کوئی بھی گفتگو نہیں کی۔ جوان طالب علم بھی خاموش تھا اور تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا باپ کے پیچھے چلا آرہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں سیّد کے گھر کے دروازہ پر پہنچ گئے۔ شیخ محمد امین نے دروازہ کی زنجیر پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کو کھٹکھٹایا۔ کچھ لمحے بعد ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا اور دونوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ شیخ محمد امین نے سلام کے بعد اس سے سیّد کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے فوراً اپنے ہاتھوں سے ایک جانب اشارہ کیا اور بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے جناب درس دینے کے لیے مسجد گئے۔

شیخ محمد امین نے اپنا ہاتھ فوراً اپنے بیٹے کے شانہ پر رکھا اور کہا:

''چلو دیر ہونے سے پہلے پہونچ جائیں''۔

دونوں نے اس بوڑھے آدمی کو خدا حافظ کہا اور اس مسجد کی طرف چل پڑے جدھر بوڑھے نے اشارہ کیا تھا۔ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر اپنے داہنی طرف مڑے۔ ناگاہ سید کا چہرہ دکھائی دیا جو مسجد میں داخل ہورہے تھے۔ شیخ محمد امین اور ان کے بیٹے جلدی سے مسجد تک پہونچے اور سیّد کے پیچھے مسجد میں داخل ہوئے۔

مسجد کے اندر سیّد کے شاگرد احترام میں اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے تھے اور صلوٰۃ بھیج رہے تھے۔ شیخ محمد امین فوراً سیّد کی طرف گئے اور انہیں سلام کیا۔ سیّد نے تعجب سے شیخ کو دیکھا اور محبت بھری مسکراہٹ سے سلام کا جواب دیا۔ بغلگیر ہوئے، دونوں نے کچھ دیر ایک دوسرے کی احوال پرسی کی۔ جوان طالب علم وہیں مسجد میں نیچے کی طرف دوسرے طلبا کے درمیان چلا گیا اور دونوں کو دیکھنے لگا۔

سیّد کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ان کے چہرہ کو پہلے سے زیادہ جاذب نظر بنارہی تھی۔ ان کے اشارہ پر شیخ محمد امین فرش پر بیٹھ گئے۔ سبھی شاگرد بھی اپنی اپنی جگہوں پر

بیٹھ گئے اور مسجد کی فضا میں ایک سکوت پھیل گیا۔

سیّد نے اپنی گفتگو شروع کی۔ ایک نظر شیخ محمد امین کو دیکھا اور ان کی موجودگی کا ذکر اپنے درس کے اس جلسہ میں احترام کے ساتھ کیا۔ جوان طالب علم شاگردوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا اور سیّد کے ہر دلعزیز نورانی چہرہ کو دیکھنے میں محو تھا۔ ایک لمحہ کے لیے بھی نظریں نہیں ہٹاتا تھا۔

سیّد علماء اور شہر کے لوگوں میں بہت زیادہ مقبول تھے۔ ان کے علم اور تقویٰ کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ انہوں نے اپنے سلسلۂ کلام کا آغاز کیا۔ ایک اہم فقہی مسئلہ کے بارے میں بحث چل رہی تھی۔ انہوں نے اس مسئلہ کو بہت ہی مہارت سے اور محکم دلیلوں کے ذریعے ثابت کردیا۔ پھر انہوں نے شاگردوں پر ایک نگاہ ڈالی اور پوچھا:

''کسی کو کوئی شبہ تو نہیں؟''

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ شاگردوں کے لیے سیّد کی دلیلیں اس قدر محکم تھیں کہ کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔

سیّد نے دوبارہ باآواز بلند کہا:

''یعنی تم میں سے کسی کو اس بحث پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

پھر بھی سکوت اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے سید کے کلاس کی خاموشی کو ریزہ ریزہ کردیا۔ وہ شیخ محمد امین کا بیٹا تھا جو شاگردوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں کے چہرے اس کی طرف مڑ گئے۔ ان کی نگاہیں متعجب تھیں۔ کوئی بھی اسے پہچانتا نہ تھا۔

سیّد نے نظریں گھما کر شاگردوں کو دیکھا۔ وہ طالب علم کھڑا تھا۔ سید نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے اعتراضات سننے کے منتظر رہے۔

جوان طالب علم نے ادب واحترام سے کہنا شروع کیا اور محکم دلیلوں سے سیّد کے نظریہ کو رد کردیا۔ سیّد حیرت میں پڑ گئے۔ شاگردوں کو بھی تعجب ہوا اور اس جوان

طالب علم کو غور سے دیکھنے لگے۔ شیخ محمد امین بھی مبہوت ہو گئے تھے اور اپنے بیٹے پر نگاہ ڈالی۔ شاگردوں کے درمیان ایک ہمہمہ بلند ہوا۔

سیّد نے بہت ہی تواضع سے شاگردوں کو مخاطب کیا اور کہا:

''میں اپنے نظریہ سے دستبردار ہوتا ہوں۔ یہ جوان طالب علم جو کچھ کہتا ہے درست ہے''۔

شاگردوں کا شور اور زیادہ ہوا۔ وہ جوان طالب علم جو ابھی بھی اپنی جگہ پر کھڑا تھا سیّد کی طرف رُخ کر کے کہا:

''استاد اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو میرے پاس اور اہم ترین دلیلیں بھی ہیں جو آپ کے نظریہ کو تقویت اور مضبوطی فراہم کرتی ہیں''۔

سیّد نے اجازت دے دی۔ جوان طالب علم ایک ایک دلیل کو بیان کرنے لگا۔ تعجب سے سیّد کی حالت غیر ہوگئی۔ شاگردوں کا شور وغل اور زیادہ ہوا۔ ہر شخص نے بلند آواز سے جوان طالب علم کو شاباشی دی۔

سیّد جن کی آنکھوں سے بے پناہ خوشی ٹپک رہی تھی کئی مرتبہ اس جوان طالب علم کی تعریف کی اور پوچھا کہ یہ کون ہے جسے میں نے اس سے پہلے تمہارے درمیان نہیں دیکھا تھا۔

سبھی خاموش تھے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا کیونکہ کوئی بھی اسے پہچانتا نہیں تھا۔

اس وقت شیخ محمد امین اپنی جگہ سے اُٹھے۔ سیّد کی طرف رُخ کر کے کہا کہ یہ میرا بیٹا شیخ مرتضیٰ[1] ہے اور میرے ساتھ کربلا آیا ہے۔

سیّد نے محبت بھری نگاہیں شیخ امین پر ڈالیں اور خوش دِلی سے کہا:

''مرحبا شیخ! مرحبا! تمہارے ذہین بیٹے کا مستقبل روشن وتابناک ہے''۔

سیّد نے اتنی بات کہی اور درس کے ختم ہونے کا اعلان کیا۔ پھر اس کی طرف گئے

۱۔ شیخ مرتضیٰ: استاد اعظم شیخ مرتضیٰ انصاری۔

جوان طالب علم سر جھکائے ہوئے تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

تمام شاگردوں نے سیّد اور جوان طالب علم کے گرد حلقہ کرلیا۔ شیخ محمد امین دور سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ سیّد نے اس جوان طالب علم کی پیشانی کو بوسہ دیا اور احترام کے ساتھ شیخ محمد امین کے پاس لائے اور کہا کہ شیخ مرتضیٰ کو حصولِ علم جاری رکھنے کے لیے چاہیے کہ ہمارے پاس کربلا میں رہیں۔ یہ جلد ہی ایک بزرگ فقیہا بن جائیں گے۔

شیخ محمد امین متبسم ہوئے اور کہا جب تک کہ وہ خود نہ چاہے، سیّد اور شاگردوں نے جوان طالب علم کی طرف رُخ کیا۔ جوان طالب علم نے سر کو اطمینان سے اُٹھایا۔ سیّد کی طرف دیکھا اور کہا:

''استاد بسر و چشم میں کربلا میں رہوں گا''۔

○○

۱۔ فقیہ: علم فقہ کے ایک دینی عالم اور محقق۔

خالی بلبلے کی مانند

وہ چھوٹے کمرے کے قریب کھڑے ہوئے جسے تنور خانہ کہتے تھے، لیکن گرم گرم تازہ روٹی کی خوشبو ہمیشہ کی طرح انہیں اچھی نہیں لگی۔ ان کے ذہن میں بالکل یہ خیال نہیں آیا کہ صغرا بیگم روٹی پکا رہی ہے۔ وہ پس و پیش میں تھے کہ رُکیں یا جائیں۔

اذان کا وقت ہوگیا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں ہلکا سا رعشہ تھا۔ مسجد تک فاصلہ بھی نہیں تھا، اور دیر بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ 'لاحول'[1] پڑھتے ہوئے دروازہ کھولا۔ تیز تیز چل پڑے اور مسجد پہنچ گئے۔ مگر...

وہ واپس ہوئے۔ دوبارہ حوض کے کنارے بیٹھ گئے۔ تصور میں اپنی بیوی کے چہرہ کو مجسم کیا۔ غصہ تھے اور بے قرار۔

سیّد[2] نے دل میں سوچا، کتنی عجیب بات ہے۔ میں نے کبھی بھی اسے ایسا نہیں

۱۔ لاحول: لاحول ولاقوۃ الاباللہ

۱۔ سیّد: علامہ سیّد علی طباطبائی اپنے زمانہ کے عظیم مراجع میں سے تھے۔ ۱۱۶۱ ہجری قمری کو کاظمین میں پیدا ہوئے۔ سیّد علی طباطبائی فقہ، اصول، تفسیر، حدیث اور دوسرے دینی علوم میں نابغہ شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی کلاسیں برسوں کربلا اور عراق کے دیگر علمی شہروں میں ہوا کرتی تھیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب 'ریاض المسائل' ہے جو علم فقہ کے بارے میں ہے اور جس نے انہیں علماء کے درمیان صاحبِ ریاض کے نام سے مشہور کردیا۔ وہ تقویٰ اچھا اخلاق، امانت داری اور پاکدامنی میں زبان زدِ خلائق تھے۔ اس زمانہ میں جب وہابیوں نے کربلا پر حملہ کردیا تھا مردانہ وار لڑے اور انہیں شہر سے باہر کھدیڑ دیا۔ ۱۲۳۱ ہجری قمری کربلا میں انتقال فرمایا اور ان کا جسم مبارک حرم امام حسینؑ میں شہداء کے پائینتی دفن ہوا۔

دیکھا۔ اتنے متقی اور پرہیز گار انسان کی بیٹی اور ایسی باتیں۔ افسوس!

انہوں نے حوض کے پانی پر ہاتھ مارا۔ پانی پر لہریں اُبھریں۔ کچھ حباب سطحِ آب پر نمودار ہوئے اور ایک ایک کر کے ٹوٹ کر غائب ہو گئے۔ سیّد نے سوچا نامناسب گفتگو کی عمر اس بلبلہ کی طرح کم ہوتی ہے۔ اندر سے خالی اور فنا پذیر۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

اذان کی آواز آنی شروع ہوگئی۔ یہ مسجد کے ادھیڑ عمر کے خادم بُریر کی آواز تھی جو مسجد کے مینارہ سے آرہی تھی۔

سیّد اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خود سے کہا: اب لوگ آرہے ہونگے اور انتظار کریں گے۔ اگر نہیں جاؤں گا تو وہ کیا کہیں گے۔

سیّد چند قدم چلے۔ تنور خانہ کے قریب پھر خیالات میں کھو گئے۔ سوچا کہ بیوی کو آواز دیں اور دوبارہ اس سے بات کرلیں تا کہ جو کچھ غبار دونوں کے دل میں ہے صاف ہو جائے۔ ہر چند کہ قصور ان کی بیوی کا تھا، لیکن درگزر کر دینا چاہئے۔ تنور خانہ کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہا کہ ایک آواز کانوں میں پڑی۔

''سیّد علی صاحب سلام۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ پروردگار آپ کو طول عمر عطا کرے''۔

یہ صغرا بیگم تھی جس نے اپنے چہرہ اور سر کو چھپا رکھا تھا اور نظریں جھکائے ہوئے تھی۔ سیّد فوراً ہی اپنی کیفیت میں واپس آ گئے۔ اپنا سر نہیں اُٹھایا۔ صرف جواب دیا:

''بہن سلام، خدا تمہیں اور تمہارے متعلقین کو سلامت رکھے۔ تمہارے شوہر کا کیا حال ہے۔ گھر سے باہر نکلتے ہیں؟''

صغرا بیگم نے ایک آہ کھینچی۔ دالان کے وسط میں آئیں۔ اپنے دل کو تازہ ہوا سے پر کیا۔ پھر کہا:

''جناب کیا کہوں، ان کی کھانسی تو کم ہوگئی ہے، مگر بالکل ختم نہیں ہوئی

ہے۔ آپ کے پاس آئی ہوں کہ ان کے لیے نماز میں دُعا کیجیے گا''۔

سیّد کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ دل میں ایک پھانس سی چبھتی محسوس ہوئی۔

''خدا انہیں شفا عطا فرمائے۔ میں ان کے لیے ہمیشہ دُعا گو ہوں۔ پھر بھی ان کے لیے دوبارہ 'امن یجیب' کا عمل ضرور کروں گا''۔

صغرا بیگم کا دل بھر آیا۔ اپنی چادر کے کونے سے اپنے آنسو پوچھے اور تنور خانہ کی طرف پلٹتے وقت نحیف آواز میں ملتجی ہوئیں:

''پروردگارا، میرے چھوٹے چھوٹے بچوں پر رحم کر''۔

اچانک سیّد کو اذان کی یاد آ گئی۔ اب بُریر خدمت گار کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ فوراً صحن کا دروازہ کھولا کہ جائیں۔ جب اذان کا وقت ہوتا تھا، اُن کی زوجہ پہچانے کے لیے آتی تھیں۔ محبت سے دروازہ کو ان کے لیے کھولتی تھیں اور کہتی تھیں:

''جناب التماس دُعا، خدا حافظ''۔

وہ علامہ وحید بہبہانی[1] کی بیٹی تھیں۔ سید کے جلیل القدر استاد کی بیٹی۔

لیکن اس روز وہ نہیں آئیں۔ سیّد نے صرف ان کی آواز تنور خانہ سے سنی کہ صغری بیگم سے پوچھ رہی تھیں:

''کیا آقا چلے گئے؟''

اور صغری بیگم نے جواب دیا کہ ہاں۔ مسجد چلے گئے۔

سیّد کا دل کانپ اُٹھا۔ دروازے کو دوبارہ بند کیا اور رک گئے۔ حلق خشک ہوگیا تھا اور زبان میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔ اپنے کمرہ کی طرف واپس مڑے اور اس کے اندر قدم رکھا۔ ایک زوردار آہ کھینچی اور بیٹھ گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ پورا کمرہ کتابوں کی الماریوں سمیت گھوم رہا ہے۔

۱۔ بہبہانی: عراق میں شیعوں کے ایک بزرگ عالم۔

اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور زیرلب کہا:

''لاحول ولاقوۃ الاباللہ''۔

تھوڑی دیر گذری۔ یہاں تک کہ انہیں کچھ سکون محسوس ہوا۔ فوراً ہی اپنا جانماز بچھایا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔

○

حاجی مصعب نے کھڑکی کے پاس سے ہٹتے ہوئے کہا:

''شاید جناب بیمار ہیں''۔

حاجی خلیل بغدادی نے اپنی تسبیح کے موٹے موٹے دانوں کو حرکت دی اور کہا:

''لیکن ابھی وہ ظہر کے بعد آئے تھے اور مجھ سے دہی خریدا تھا''۔

نمازی کھڑے ہو چکے تھے اور پلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے اور مسجد کے دروازہ پر نگاہیں جمی ہوئی تھیں کہ سیّد جلدی تشریف لائیں اور نماز شروع کریں۔

ایک بوڑھے شخص نے مسجد کے آخر سے بلند آواز میں کہا:

''اس طرح ٹھیک نہیں ہے۔ اوّل وقت کی فضیلت چھوٹ جائے گی۔ ایک آدمی اُن کے گھر چلا جائے''۔

ایک دوسرے معمر شخص نے جو اُس کی بغل میں تھا ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''ٹھیک ہے۔ ان کا گھر دریا پار نہیں ہے۔ اسی جگہ ہے، چار پانچ گھر آگے''۔

حاجی مصعب نے کہا:

''آپ لوگ ٹھہرئے۔ میں جاتا ہوں''۔

''جلدی کرو حاجی''۔

حاجی مصعب نے اپنی چپل پہنی اور جلدی سے گلی میں چل دیئے۔ لمبا سا عربی لباس تھا اور سر پر سفید ٹوپی۔ لمبے قد کے ادھیڑ عمر کے تھے۔ پیشے سے درزی تھے۔ لیکن مسجد کے سبھی کاموں میں شامل رہتے تھے۔

سیّد کے گھر کے قریب پہنچے تو کئی بار دروازے پر دستک دی۔ ایک چھوٹے سے بچّے نے دروازہ کھولا۔

''حاجی صاحب سلام''۔

''سلام میرے پھول۔ جناب کہاں ہیں؟ کیا ہو گیا؟ مسجد کیوں نہیں آئے''۔

بچہ نے تعجب سے گلی کے باہر نظریں دوڑائیں اور پوچھا:

''نہیں پہنچے؟ گئے تو؟''

حاجی مصعب نے تعجب سے آنکھیں گھمائیں۔

''گئے؟ تو کہاں ہیں۔ مسجد تو نہیں پہنچے۔ جاؤ اپنی والدہ سے پوچھو۔ دیکھو کہاں گئے ہیں''۔

بچہ نے کہا:

''میں نے خود دیکھا۔ اذان کا وقت تھا''۔

حاجی مصعب نے اپنی ٹوپی اُٹھائی۔ کئی بار سبحان اللہ کہا اور گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک بغور نگاہ دوڑائی اور کہا:

''لاالٰہ الا اللہ، یعنی کہاں چلے گئے؟''

پلٹنے والے تھے کہ گھر کا دروازہ پورا کھل گیا۔

''حاجی صاحب سلام علیکم''۔

یہ سیّد تھے۔ حاجی کا دل اُچھل پڑا۔ رک گئے اور ان کو گھورنے لگے، صرف لڑکھڑاتی زبان سے اتنا کہا:

''علیکم السلام.....ورحمۃ اللہ.....آ.....آپ''۔

سیّد نے اُن کے شانہ پر ہاتھ رکھا، بہت ہی محبت اور سکون سے کہا:

''آج مجھے اپنی عدالت میں شک ہو گیا ہے۔ اس بنا پر میں آپ کا پیش نماز نہیں بن سکتا، کیونکہ اگر امامِ جماعت عادل نہ ہو تو مامومین کو نماز نہیں

پڑھا سکتا ہے۔ آپ لوگ خود ہی نماز پڑھ لیں''۔

حاجی مصعب کے ہونٹ کانپنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ اپنے دل میں سوچنے لگے:

''کیا جناب سیّد علی طباطبائی سے زیادہ عادل اور باتقویٰ شخص کربلا میں مل سکتا ہے؟ انہیں کیا ہوگیا ہے''۔

''کیوں... کیوں جناب؟ کیا کوئی بات ہوگئی''۔

سیّد کے ہونٹوں پر ہلکی سی تلخ مسکراہٹ اُبھری اور کشمکش میں پڑ گئے کہ کہیں یا نہ کہیں۔ چارہ نہیں تھا۔ کہہ دینا چاہیے۔

آج میری بیوی نے مجھ سے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ میں اپنا قابو کھو بیٹھا اور ان کے جواب میں غصے سے کہا:

''جو کچھ تم نے مجھے کہا، وہ تمہاری طرف واپس پلٹ جائے''۔

سیّد نے سر جھکالیا اور کئی مرتبہ استغفار کیا۔ پسینہ کے موٹے موٹے قطرے ان کے کانوں کے چاروں طرف اور پیشانی پر ابھر آئے۔ حاجی مصعب نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔

''اسی بنا پر مجھے اپنی عدالت میں شک ہوگیا ہے اور تمہارا امامِ جماعت نہیں بن سکتا۔ کوئی دوسرا شخص تلاش کرو''۔

''یعنی... یعنی ہمیشہ کے لیے؟''

''جب تک کہ میری بیوی مجھ سے راضی نہ ہوجائے اور مجھے معاف نہ کردے''۔

آنسوؤں کے سفید قطرے سیّد کے چہرے اور کھچڑی داڑھی پر بہہ کر آ گئے۔ حاجی مصعب نے فوراً سیّد کے چہرہ کو بوسہ دیا اور کہا:

''انشاءاللہ کل ہی ہم مسجد میں آپ کی زیارت کریں گے''۔

حاجی مصعب چلے گئے۔ سیّد نے دروازہ بند کیا اور گھر کے صحن میں واپس آ گئے۔ ان کا دل ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ حوض کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے محسوس کیا کہ آج ان کا دل اپنی بیوی کے لیے اور زیادہ بے چین ہے۔ حوض کے کنارے بیٹھ گئے اور آہستہ سے پکارا:

''بیگم کہاں ہو؟''

○○

استاد کا عجیب خواب

استاد مسجد کے ایک گوشہ میں تنِ تنہا خاموش اپنے خیالوں میں غرق تھے۔ زیادہ تر شاگرد اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ مسجد میں ان کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ استاد کی حالت منقلب تھی۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی فکر کسی اور ہی دُنیا میں محوِ پرواز ہے۔ استاد کی دگرگوں طبیعت نے ان کے دل کا سکون چھین لیا تھا۔ دھیرے دھیرے زیرلب دعا پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے۔ پچھلی رات ایک عجیب وغریب خواب دیکھا تھا۔ یہ خواب ان کو سکون نہیں لینے دے رہا تھا۔ ہر لمحہ وہ خواب یاد آتا اور ان کو بے قرار کر دیتا تھا۔

اسی اثنا میں مسجد کا دروازہ کھلا۔ کچھ عورتیں مسجد کے احاطہ میں داخل ہوئیں اور شبستان کے باہر انتظار میں کھڑی ہوگئیں۔ ان میں سے ایک عورت جس کا نام فاطمہ تھا اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے مسجد کے اندر داخل ہوئی اور اپنی نظریں مسجد کے اندر دوڑائی۔ دوسری عورتوں نے بھی باہر سے اس کی نگاہ کا پیچھا کیا۔ چند لحظہ بعد ایسا لگا گویا اسے اپنی گمشدہ چیز مل گئی ہو۔ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ وہ استاد کے پاس آئی اور ان کے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ دونوں بچے اپنی ماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسجد کی فضا میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عورت نے پُرسکون لہجہ میں سلام کیا۔ استاد عورت کے سلام کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ عورت نے قدرے بلند آواز میں کہا:

''سلام علیکم اے شیخ''۔

استاد (جو اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے) پلٹے۔ عورت اور دونوں بچوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کے سلام کا جواب دیا۔ اپنے چہرہ کو ہاتھ سے صاف کیا اور سر کو جھکالیا پھر عورت کے کلام کا انتظار کرنے لگے۔ عورت نے بغیر کسی تمہید کے استاد کی طرف رُخ کر کے کہا:

''اے شیخ، میں اپنے دونوں بیٹوں کو آپ کے پاس لائی ہوں تا کہ آپ انہیں فقہ اور قرآنی علوم سکھادیں''۔

استاد نے ان دونوں بچوں پر ایک نظر ڈالی۔ اپنی آنکھوں کو گھمایا۔ عورت خاموش سے انتظار کر رہی تھی کہ استاد اس کی بات کا جواب دیں۔ ایسا لگا کہ استاد کو کوئی بات یاد آ گئی۔ اچانک استاد کی حالت متغیر ہوگئی۔ کیا دیکھ رہیں۔ استاد نے ایک لمحے کے لیے مسجد کے خوبصورت محراب پر نظریں جمائیں اور اس کے بعد زار و قطار رونے لگے۔

عورت اور اس کے دونوں چھوٹے بچے استاد کے اس عمل سے حیرت میں پڑ گئے۔ دوسری عورتوں نے بھی حیرت سے استاد کی طرف دیکھا۔

کیا ہوگیا تھا؟ استاد کیوں رو رہے تھے؟ وہ بھی عورت کی اس درخواست کے سامنے؟

عورت نے انتظار نہیں کیا۔ فوراً بولی:

''اے شیخ آپ کی حالت منقلب کیوں ہے؟ شاید میں نے کوئی دل دُکھا دینے والی بات آپ سے کہہ دی کہ...''

استاد نے عورت کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

''نہیں نہیں''۔

اس کے بعد استاد نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا رومال نکالا اور اپنی آنکھوں کو اس سے صاف کیا اور کہنا شروع کیا:

''پچھلی رات میں نے اسلام کی عظیم خاتون حضرت فاطمۂ زہرا کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے اپنے دونوں عزیز بچوں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو میرے سپرد کیا اور فرمایا کہ انہیں فقہ کی تعلیم دو۔ میں اس خواب کے بعد سے اس وقت تک عجیب وغریب کیفیت سے دوچار تھا، اور میرے ذہن سے اس کا خیال ایک لحظہ کے لیے بھی دُور نہیں ہورہا تھا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ یہ عجیب خواب کی اچھی تعبیر مل گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے، خدا کا شکر ہے''۔

عورت خاموش رہی اور کچھ نہیں کہا۔ استاد کے ہونٹوں پر ایک گہرا تبسم ظاہر ہوا۔ انہوں نے احترام کے ساتھ ان دونوں معصوم بچوں کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھے اور ان دونوں کو دل و جان سے قبول کرلیا[1]۔

○○

[1] وہ دونوں بچے سیّد رضی اور سیّد مرتضیٰ تھے جو بعد میں شیعوں کے نامور اور بزرگ علماء میں جانے جاتے ہیں۔ شیخ بھی شیخ مفید تھے۔

سیّد جواد تمہارے اُوپر افسوس

تم بے حال کیوں ہو۔ سیّد جواد[1] تمہیں گھبراہٹ کیوں ہورہی ہے۔ آج کی رات ان راتوں میں سے ہے کہ تمہارا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا ہے۔ تم نے بیزاری سے چند لقمہ کھایا اور ہر لقمہ کے ساتھ ایک گلاس پانی پیا۔ تمہاری بیوی کی سوالیہ آنکھیں بار بار تمہاری طرف اٹھ رہی ہیں۔ تم فکرمند ہو۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ یہاں تک کہ دروازہ کے پیچھے سے دھیرے دھیرے آنے والی آواز تمہیں متوجہ نہیں کرپارہی ہے۔ آواز کمرہ میں برابر گونج رہی ہے لیکن تم ادھر متوجہ نہیں ہوتے ہو۔ ایک بچہ تمہاری گردن میں بازو حمائل کرکے میٹھی میٹھی بولی میں کہتا ہے:

''بابا آپ سے انہیں کام ہے''۔

تم دسترخوان سے فوراً اٹھ جاتے ہو۔ دروازے پر جاتے ہو۔ استاد بحرالعلوم[2] کا خادم تمہیں سلام کہتا ہے اور جلدی جلدی سے کہتا ہے کہ جناب نے فرمایا ہے کہ آپ ابھی فوراً ان کے یہاں تشریف لائیں۔ کھانا ان کے سامنے رکھا ہوا ہے اور فرمایا ہے کہ میں

[1] سیّد جواد: سیّد جواد عاملی۔ شیعہ دانشمند اور فقیہ۔

[2] استاد بحرالعلوم: علامہ سیّد مہدی بحرالعلوم ۱۱۵۳ ہجری قمری میں پیدا ہوئے۔ بروجرد کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں ہی علم کے اعلیٰ مدارج کو طے کرلیا تھا اور بہت جلد شیعوں کے متقی، پرہیزگار اور نابغہ عالم ہوگئے۔ ۱۲۱۲ ہجری قمری میں انتقال فرمایا اور ان کی آرام گاہ نجف اشرف میں حرمِ امام علیؑ میں ہے۔ ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے بارہا امامِ زمانہؑ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے۔

کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک کہ سیّد جواد خود یہاں نہ آ جائیں۔

تمہاری مضطرب نگاہوں سے عدم اطمینان اور بے چینی نمایاں ہے۔تم کمرہ میں جاتے ہو، اپنی عباشانوں پر ڈالتے ہو اور اپنی زوجہ سے کہتے ہو کہ میں ابھی اسی وقت استاد بحرالعلوم کے یہاں جا رہا ہوں، انہیں مجھ سے کچھ کام ہے۔

تم گھر سے باہر نکل پڑتے ہو۔ چاند نے دُور تک پھیلی اپنی دودھیا چاندنی سے تنگ اور سنسان گلیوں کو بھر دیا ہے۔ چراغوں کی ٹمٹماتی لوؤں کا ارتعاش تمہیں نظر آ رہا ہے۔ خادم کی سانسیں پھول رہی ہیں اور وہ جلدی جلدی قدم بڑھا رہا ہے۔ چھوٹے بڑے درختوں اور گھروں کے سائے گلیوں میں ہل رہے ہیں۔ کچی گلیوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور ہوا میں دُھول اُڑ رہی ہے۔

اُستاد کا چہرہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو پا رہا ہے، مگر تم اسی فکر میں ہو کہ استاد کا انداز روزانہ کی طرح نہیں ہے۔ ہمیشہ کی طرح متبسم نہیں ہیں۔ اور نہ ہی معمول کے مطابق تفکر و تفحص میں سر جھکائے ہوئے ہیں۔

خادم سے پوچھنا چاہتے ہو کہ کیا ہو گیا ہے۔ آخر اس عجلت کا سبب کیا ہے، کیا استاد۔۔۔؟ تم اسے دیکھتے ہو کہ وہ تم سے آگے نکل گیا ہے۔ بلند آواز میں کہتے ہو:

''آرام سے''۔

وہ مڑتا ہے:

''سیّد جواد صاحب جلدی کیجیے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے''۔

تم جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہو اور گلی کے موڑ سے مڑتے ہوئے سوچنے لگتے ہو:

''کھانا کس لیے''۔

میں استاد کا مہمان بھی نہیں ہوں، کیا ہو گیا ہے کہ وہ دسترخوان پر میرے منتظر ہیں۔

کھڑکھڑ کی آواز سے تمہاری سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تم اپنے آس پاس

نظریں دوڑاتے ہو۔ اس اندھیرے میں بلّی کی آنکھوں کی تیز چمک تمہیں خیالات سے باہر لاتی ہے۔ خادم دوبارہ آواز دیتا ہے:

''سیّد جواد کافی دیر ہو چکی ہے''۔

تم بعجلت تمام خود کو وہاں تک پہنچاتے ہو۔ خادم فانوس کو اپنے ہاتھوں میں گھماتا ہے۔ تم اچانک اس کے شانہ پر ہاتھ مار کر پوچھتے ہو:

''رات کے اس وقت استاد کو مجھ سے کیا کام ہے''۔

خادم پھیکی سی ہنسی ہنستا ہے اور کہتا ہے:

''میں نہیں جانتا، لیکن استاد کافی غمگین ہیں''۔

تمہارے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ تم پھر کچھ نہیں کہہ پاتے ہو۔ اپنی عبا کو اپنی گردن پر درست کرتے ہو۔ گھر کے قریب پہنچتے ہو۔ خادم رُک جاتا ہے اور تمہیں اشارہ کرتا ہے۔ تم اس کے ساتھ چلتے ہو اور گھر میں داخل ہوتے ہو۔ خادم گھر کے دروازہ کو آہستہ سے بند کر دیتا ہے۔ تمہاری نظریں استاد اور کھانے کی سینی پر پڑتی ہیں۔ تمہاری آواز کانپنے لگتی ہے۔

''سلام علیکم''۔

استاد تمہاری طرف رُخ کرتے ہیں۔

''سلامت رہو''۔

پھر غصّہ میں کہتے ہیں:

''سیّد جواد تم خدا سے ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تمہیں خدا سے شرم نہیں آتی؟''

کمرہ کا چوکیدار چپ چاپ چلا جاتا ہے۔ تمہاری ہمت نہیں پڑ رہی ہے کہ استاد کی نگاہوں کی طرف دیکھو۔ یقیناً کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہے۔ تمہارے ذہن میں طوفان اُٹھ رہا ہے۔ تمہاری فکر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پا رہی ہے۔ غصّہ کے سبب استاد کے دل پذیر چہرہ کا سکون درہم برہم ہو گیا ہے۔ مَری ہوئی آواز میں پوچھتے ہو:

''جناب استاد ارشاد فرمائیں کہ کیا ہوا ہے؟ مجھ سے کون سا گناہ سرزد ہوگیا ہے؟''

استاد نے اپنی نظریں تمہاری طرف سے ہٹالی ہیں۔ سینی کے کھانے کو دیکھتے ہیں اور بڑی تکلیف سے جواب دیتے ہیں:

''سات دن اور سات راتیں گزر گئی ہیں اور تمہارے پڑوسی کو ایک دانہ نہیں ملا ہے۔ ان کے پاس نہ تو گیہوں ہے اور نہ چاول۔ اس درمیان انہوں نے اپنی گلی کے نکڑ کے دُکاندار سے کچھ خرمہ اُدھار لیا اور اس طرح اس خرمہ سے انہوں نے اپنے دن رات بسر کیے۔ آج پھر وہ دُکاندار کے پاس گئے کہ خرمہ اُدھار لیں مگر دُکاندار نے ان سے کہا کہ تمہارا اُدھار زیادہ ہوگیا ہے اس لیے مزید اُدھار نہیں دے سکتا ہوں۔ وہ خالی ہاتھ شرمندگی سے گھر واپس آ گیا۔ آج کی رات اس کی بیوی اور بچے بے غذا ہیں۔ سیّد جواد تمہارے اوپر افسوس!''

تمہارا غم کم نہیں ہو رہا ہے۔ تم رونے لگتے ہو۔ پھر استاد کے پاس بیٹھ جاتے ہو اور کہتے ہو:

''خدا کی قسم میں اس کیفیت سے لاعلم تھا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا تو ضرور ان کی مدد کرتا''۔

استاد مضطرب ہیں۔ غصہ سے تمہاری طرف دیکھتے ہیں اور دوبارہ فرماتے ہیں:

''میری تمام داد و فریاد اس لیے ہے کہ تم اپنے پڑوسی کے حالات سے بے خبر کیوں رہے۔ انہوں نے سات شبانہ روز اس حالت میں گزارے اور تم اس سے لاعلم رہے۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا اور اقدام نہ کرتے تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے''۔

تمہارا گریہ اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ تم استاد کے اور قریب سرک جاتے ہو۔

''اب آپ حکم فرمائیں کہ میں کیا کروں؟ جانتا ہوں کہ مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی، مگر یقین فرمائیں کہ یہ عمل عمداً نہیں تھا''۔

استاد کو تھوڑا سکون ملتا ہے۔ تم اپنے آنسوؤں کو پوچھتے ہو۔ استاد خادم کو اشارہ کرتے ہیں۔ خادم سینی کو اُٹھاتا ہے:

''اس مرد کے گھر تک اس کے ساتھ ساتھ جاؤ۔ اس کے گھر کے پاس یہ خادم سینی تمہارے حوالہ کردے گا اور واپس آجائے گا۔ تم اس کے گھر پر دستک دینا اور اس سے التماس کرنا کہ آج رات کا کھانا اس کے ساتھ کھاؤ گے اور ان روپیوں کو اس کے گھر کے فرش پر رکھ دینا اور معذرت کرنا کہ اس ضمن میں تم سے کوتاہی ہوئی ہے۔ میں یہیں بیٹھا ہوا ہوں۔ جب تک تم واپس نہ آجاؤ اور اس مرد مومن کے گھر کی خبر میرے لیے نہ لاؤ گے میں کھانا نہیں کھاؤں گا''۔

تم نے استاد کے ہاتھوں سے روپیہ لے لیا اور کھڑے ہوگئے۔ تم دونوں کوچہ بہ کوچہ چلنے لگے۔ لمبے اور گہرے سائے گلیوں کی لمبائی تک پھیلے ہوئے تھے۔ استاد کی تلخ گفتگو تمہارے کانوں میں گونج رہی تھی کہ اپنے کمزور اور لاچار پڑوسی کا خیال کرو۔ چند گلیاں طے کرنے کے بعد تم آخر کار اس کے گھر تک پہنچ گئے۔ خادم نے سینی تمہارے حوالہ کی اور چلا گیا۔

تم نے آہستہ سے دستک دی۔ پڑوسی دروازے پر آیا۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کو کھولا اس کی پژمردہ نگاہوں کا نور تمہاری آنکھوں پر پڑا۔ تم دونوں ایک دوسرے کی احوال پرسی کرتے ہو۔ مرد ہمسایہ تمہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ تم نے شرمندگی سے کہا کہ میں آج کی رات آپ کا مہمان بننا چاہتا ہوں۔ اجازت دیجیے کہ گھر میں داخل ہوؤں۔

مرد حیرت سے کھانے کی سینی کو دیکھتا ہے، پھر بہت ہی محبت سے تمہیں گھر کے اندر لے جاتا ہے۔ سینی کو تم نے اس کے پاس رکھ دیا اور بغیر کسی تمہید کے اپنے

برتاؤ کے سلسلے میں اس سے معذرت کی۔ اس کی حیرانی بڑھتی جارہی ہے، تمہاری گفتگو، کھانے کی سینی اور آج رات کے کھانے کی خوشبو نے اسے حیران کردیا ہے۔

مرد سوچنے لگتا ہے۔ اس کے اندر جنگ چھڑ جاتی ہے۔ وہ سینی پر اپنی نظریں جمائے ہوئے ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سینی کا یہ کھانا تمہاری زوجہ کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں ہے۔ یہ کھانا نہ تو ایرانیوں کی غذا ہے اور نہ عربوں کی۔ لیکن تم کو نہیں معلوم اور تمہارا دھیان اس طرف نہیں جارہا ہے۔

''جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ یہ کھانا کس کی طرف سے ہے میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا''۔

تم بات میں بات نکالنا چاہتے ہو تا کہ اس کا جواب نہ دینا پڑے۔ لیکن وہ اصرار کرتا ہے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ تھوڑے توقف کے بعد اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کرتے ہو۔ مرد حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ کھانے کو سونگھتا ہے اور کہتا ہے:

''میں نے اپنے حالات کسی سے بھی بیان نہیں کئے، یہاں تک کہ اپنے قریبی پڑوسیوں سے بھی پوشیدہ رکھا، مگر سیّد بحرالعلوم کو کیسے پتہ چل گیا کہ آج رات ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں''۔

مرد کے بجھے ہوئے رخسار اشک آلود ہو جاتے ہیں۔ نرمی سے تمہاری طرف دیکھ کر متبسم ہوتا ہے۔ پھر سینی میں سے آدھا کھانا اُٹھالیتا ہے اور اسے دوسرے کمرہ میں لے کر چلا جاتا ہے۔ تم خوش ہو جاتے ہو۔ تمہارے سینہ کے اندر ایک دل پذیر اطمینان مثل نسیم احاطہ کرلیتا ہے۔ تم اس مرد کی باتوں پر اور استاد بحرالعلوم کی باتوں پر غور کرنے لگتے ہو۔

○○

سورج مکھی کے مانند

میں نے سب سے پہلے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو دو کھلے ہوئے دریچوں کی طرح حسین اور خوبصورت تھیں، جن سے نرم و نازک نور ساطع ہو رہا تھا۔ اس کی بلند پیشانی چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہی تھی۔ میں اس کا فریفتہ ہوگیا۔ اس کے پروقار عمامہ کا اسیر۔ پھر میں نے اس کے لباس پر نظر دوڑائی۔ اس کی عبا اور قبا پرانی تھی جس میں جابجا جوڑ پیوند لگے ہوئے تھے لیکن اس کی سفید داڑھی کی طرح صاف ستھری اور مرتب تھی۔ مجھے اچھا لگا، مگر اس کی وضع و قطع دیکھ کر میں کبیدہ خاطر ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا:

''ضعیف آدمی ہے غالباً فقیر طالب علم ہے، ممکن ہے وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہو۔ یقیناً آبرومند شخص ہے اور لوگوں سے سوال نہیں کرتا ہے۔ بلاشبہ معقول آدمی ہے''۔

میرے قریب پہونچا تو مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی گھبراہٹ میں کہا:

''علیکم السلام''۔

وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ شفیق باپ کے تبسم سے زیادہ میٹھی تھی۔ ایسا محسوس ہوا گویا کہ میرا پورا وجود لطیف خنکی سے بھر گیا ہے۔ غالباً وہ واپس جانے ہی والا تھا کہ میں نے بے خیالی میں اسے آواز دی:

''چچا!''

وہ ٹھہر گیا۔ سورج مکھی کی طرح اپنے چہرہ کو میری طرف گھمایا اور مجھے دیکھا۔ نہیں معلوم کیوں کوئی بات میری زبان پر نہیں آرہی تھی۔ زبان میں بے ساختہ لکنت پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے اس کو کس لیے آواز دی تھی؟ میں نے خود سے کہا کہ:

''اس طرح اس کی مدد کرنا مناسب نہیں ہے ممکن ہے اسے اچھا نہ لگے۔ ممکن ہے اس طرح کہ... وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ میں اس کی مدد کر رہا ہوں۔ اس کی حالت اور خستہ حالی پر میرا دل رنجیدہ ہوا''۔

قبل اس کے کہ میں اس سے کچھ کہتا وہ میری طرف آیا۔ اچھی سی خوشبو آرہی تھی۔ کس قدر لطیف تھی۔ میں نے دوبارہ اپنے دل میں کہا:

''خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ متقی و پرہیز گار انسان ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے اشتباہ کیا ہو''۔

''بیٹا، تم نے بتایا نہیں، مجھ سے کیا کام ہے؟''

شہر نجف میں تنگ دستی میں گزر بسر کرنے والوں کی کافی تعداد تھی جن میں سے زیادہ تر افراد باعزت تھے۔ یہ لوگ بھیک نہیں مانگتے مگر ان کی وضع و قطع دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس قحط زدہ اور سخت دور میں تنگ دستی ان کے دامن گیر ہوگئی ہے۔

''اچھا میں سمجھا۔ میں سمجھا، مدد...''

اس بوڑھے آدمی نے میرے ہونٹوں کو بغور دیکھا جو زور زور سے ہل رہے تھے۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی کہ کچھ کہا جاسکے۔ مجھے اپنی بات دوبارہ کہہ دینی چاہیے۔ شاید خدا اسی بنا پر میری زیارت کو خوبی کے ساتھ قبول فرمائے۔

''چچا! آپ میرا یہ کپڑا دھو دیں اس کے بدلہ میں میں آپ کو اچھی اُجرت دوں گا''۔

اس کی مسکراہٹ چشمے کے مانند پھوٹ پڑی اور میرے دل میں جوش بھر دیا۔ مجھے سکون ملا کہ اس نے برا نہیں مانا تھا۔

''خدا کا شکر ہے، میں صرف اس بزرگ نورانی فقیر کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ شاید گھر پر اس کے بچے اس کے ہاتھوں میں ایک روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے اس کی راہ دیکھ رہے ہوتا کہ ان کے پژمردہ چہرہ پر آرزو کی بارش ہوسکے''۔

ہم لوگ کوچۂ آفتاب گیر کے موڑ پر تھے کہ اس نے اپنے پر محبت لہجہ میں کہا:

''میں تمہارے کپڑے دھونے کے لیے تیار ہوں''۔

میں ہنسا۔ وہ بھی ہنسا۔ میں نے کہا:

''منظور ہے چچا۔ آیئے چلیں۔ میرا مسافر خانہ اس طرف ہے''۔

راستہ میں مجھے محسوس ہوا کہ شاید وہ خود سے ہم کلام ہے۔ میں نے اپنی رفتار کم کردی۔ وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ اس کے لباس سے عطر کی جو خوشبو آرہی تھی اس نے مجھے چکرا دیا۔ اس کی آہستہ مترنم آواز پر کان لگایا۔ معلوم ہوا صلوات پڑھ رہا ہے۔ ایک نہیں، دس نہیں، بلکہ تیز تیز، رم جھم بارش کی طرح، ہلکی نسیم کی طرح، چاندنیکی مٹھاس کی طرح۔

○

میں تحفہ تحائف ٹھیک کر رہا تھا کہ مسافر خانہ کے صفائی عملہ نے مجھے آواز دی:

''باہر تمہیں بلا رہا ہے''۔

میں جلدی سے مسافر خانہ کے دروازہ کے پاس گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ پھول کی طرح کھل اُٹھا۔ وہی بوڑھا تھا۔ وہی پیوند دار عمامہ، عبا اور قبا کے ساتھ۔ ایک گٹھری ہاتھ میں تھی۔ میں نے اسے سلام کرنا چاہا لیکن اس نے سلام میں پہل کی۔ گٹھری کو میرے پاس رکھا اور ادب کے ساتھ کہا:

''لیجیے''۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نجف کے گلی کوچوں میں چل رہی تھی اور درختوں کے پتوں اور شاخوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ مردوں کے عربی لباس ہوا سے ہل رہے تھے۔ پیر مرد

کا عربی لباس بھی ہوا سے ہل رہا تھا۔اس کی لمبی داڑھی کے بال بھی ہوا سے ہل رہے تھے۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تا کہ اسے فوراً مزدوری دے دوں کہ وہ بھی جلدی سے اپنے اہلِ خانہ تک پہنچ جائے۔اس نے میری طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ مجھے تعجب ہوا۔ میں نے کہا:

''ذرا صبر کریں ابھی آپ کو مزدوری دیتا ہوں''۔

وہ ہنسا۔ایسی ہنسی جو شیریں و دل پذیر تھی۔

''اگر آپ کے پاس دھونے کے لیے اور کپڑے ہوں تو میں حاضر ہوں''۔

کتنی محبت سے کہا۔دل چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاؤں اور صرف اس کے گول چہرے کو دیکھتا رہوں۔اس کی پیشانی، کشیدہ اور موزوں ابرو،اس کے سفید رخسار اور اس کی آنکھیں جس نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔

''نہیں چچا۔اب کپڑے نہیں ہیں''۔

ایسا لگا کہ وہ اب جانا چاہتا ہے۔ مجھے اس بات پر زیادہ حیرانی ہوئی۔یعنی وہ بھول گیا۔گویا اسے اپنی اُجرت کی فکر نہیں ہے۔اس کا ارادہ کیا ہے۔

تبھی ادھیڑ عمر کے ایک مولانا آپہنچے۔انہوں نے پہلے میری طرف اور پھر اس گٹھری کی طرف جو میرے ہاتھ میں تھی نظر ڈالی۔اس کے بعد وہ اس بزرگ شخص کے قریب گئے اور کہا:

''سلام علیکم جناب''۔

وہ بزرگ شخص ہنسا۔اس سے ہاتھ ملایا۔محبت بھرا جواب دیا اور اس کو گلے لگایا۔

پھر مجھ سے مخاطب ہوا اور کہا:

''امیر المومنینؑ کے غریب زائر خدا حافظ۔ ہمارے لیے دُعا کرنا''۔

میرا دِل بے چین ہو گیا۔بلند آواز میں کہا:

''اور آپ کی اُجرت چچا''۔

یہ کام فی سبیل اللہ تھا۔اگر وہ قبول کرے، بیٹے اس کی اُجرت نہیں ہوا کرتی۔میرا دل اور زیادہ بے چین ہوا اُٹھا۔ یکبارگی پسینہ پسینہ ہو گیا۔اس کے برتاؤ پر مجھے شک ہوا اور مولانا کی نظروں کو دیکھ کر میں نے خود سے کہا:

''کہیں ایسا تو نہیں...''

مولانا میں اب تاب نہ تھی۔قریب آیا اور پوچھا:

''اے بندۂ خدا یہ اُجرت والا معاملہ کیا ہے؟''

''اس بوڑھے مرد فقیر نے میرے کپڑوں کو دھویا ہے اسی کی مزدوری''۔

اس کے چہرہ کا رنگ زرد ہو گیا۔مسکراہٹ جاتی رہی اور اس کے ابرو اوپر کو تن گئے۔وہ پیر مرد میری طرف آیا۔

''ارے یہ ظلم! اپنے کپڑوں کو دھونے کے لیے اس جلیل القدر شیخ کو دیا۔ تمہارے اوپر افسوس ہے۔تم خدا سے ڈرتے نہیں ہو''۔

''کس... کس... کس بات سے ڈروں۔صاف صاف کیوں نہیں کہتے''۔

پیر مرد ہمارے پہلو میں آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا:

''شیخ آیئے، چلیں۔آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

مولانا کی آنکھوں کے گوشہ سے آنسو نکل پڑے۔میرے دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔

''یہ مقدس اردبیلی ہیں''۔

''...مقدس اردبیلی۔نجف کے بزرگ زاہد اور عالم''۔

پیر مرد نے اپنی بھنویں سکوڑیں، غصہ سے اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہنا چاہا کہ میں بے اختیار اس کے قدموں پر گر پڑا۔

○○